فہیم اعظمی
آتش نگر کے
پھول

آرٹمس نگر کے پھول

فہیم اعظمی

# آرٹمس نگر کے پھول

اور دوسرے افسانے

مکتبۂ صریر

پہلی اشاعت : جنوری ۱۹۹۵ء

تعداد : ایک ہزار

کتابت : عبدالرحیم انصاری

طباعت : نوید پریس عظیم مارکیٹ نمبر ۲ ناظم آباد کراچی

قیمت : اسّی روپے

پتا : مکتبۂ صریر، سی ۱۴، بلاک ۲۰، فیڈرل بی ایریا

کراچی - ۷۵۹۵۰

# فہرست

# انتساب

اُن افسانہ نگاروں کے نام جنھوں نے

اردو ادب میں کہانی کی روایت کو جدید فکری

اور عملی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

قرآن الحکیم

سورۃ الاعراف آیت ۱۷۶

# معروضات

میرے افسانوں کا تیسرا مجموعہ قارئین کی نذر ہے "صریر" کی ادارت نے اتنا مصروف رکھا کہ یہ مجموعہ تقریباً تین سال سے کتابت کیا ہوا رکھا تھا اس دوران کچھ نئے افسانے بھی اس میں شامل کیے گئے۔ اس کے بہت سے افسانے سنہ ۱۹۸۰ء اور سنہ ۱۹۹۰ء کے درمیان لکھے گئے۔ بیشتر افسانے شائع ہو چکے ہیں۔

ماڈرن اور پوسٹ ماڈرن افسانوں کے بارے میں اکثر خیال آرائیاں کی جاتی رہی ہیں۔ اب سے پندرہ سال پہلے لوگوں نے اس رائے کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا کہ افسانہ واپس آ گیا۔ ان کا خیال تھا کہ سنہ ۱۹۶۰ء اور سنہ ۱۹۷۰ء کے دوران جو افسانے میں پیچیدگی اور تجریدیت آ گئی تھی وہ ختم ہو گئی اور بیانیہ پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اس خیال کا اظہار اہلِ قلم احباب اب بھی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ افسانہ ہمیشہ تجریدی بھی رہا اور بیانیہ بھی، اُس میں اسلوب پر بھی زور رہا اور واقعات کے بیان کرنے پر بھی، اُس میں مختلف قسم کا علامتی اظہار بھی ہوتا رہا اور سیدھا سادہ بیانیہ اظہار بھی۔ سچویشن اور کردار پر بھی زور رہا اور پلاٹ اور کردار کے بغیر افسانے پر بھی۔

جدید افسانے کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ فرد کی داخلیت کی عکاسی کرے یا معاشرے کو موضوع بنائے۔ فرد جدید افسانوں میں زیادہ تر اس لیے نمایاں ہوتا تھا کہ ایک طرف تو اشتراکی فلسفے نے فرد کو صرف پروڈکشن کا ذریعہ بنا رکھا تھا اور دوسری جانب سرمایہ دار ملکوں نے جنگ مسلط کر کے فرد کو بغیر اس کی مرضی کے کینن فوڈر (CANON FODDER)

بنا دیا تھا جس کے ردِ عمل کے طور پر فرد نے اپنی فردیت کو منوانا چاہا اور بورژوا منطق، اخلاق، روایات اور تصنّع کے خلاف بغاوت کی۔ شاونزم اور فسطائیت کی انانیت، اور آر سینل کی بڑھتی ہوئی تباہ کن قوت ادیبوں کو وجودیت کی جانب لے گئی جس میں انسان کے جوہر سے انکار کرکے اُسے DE DROP کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ فرد کے استحصال نے دو نظریات کو جنم دیا، ایک وہ جس نے دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی مصیبتوں کے بعد دوسری دنیا میں راحت کے امکانات کو اپنایا اور دوسرے وہ جنھوں نے آدمی کے پیدا ہونے کو فال بد سمجھا اور فکر و مصیبت کے بعد قبر کو اس کی آخری منزل سمجھا جس کے بعد کوئی سالوشن نہ تھا۔ تیسری جماعت ادیبوں کی وہ تھی جو ایٹم بم کے وارہیڈ پر بیٹھ کر بہتر انسانیت، روشن مستقبل اور لال سورج کے گن گاتی رہی۔ اور جب نیطشے نے تخلیقی جہت میں الہام کی بات کی اور کہا۔

"ہر شے بغیر ارادے کے وقوع پذیر ہوتی ہے جیسے کہ آزادی، خود مختاری، قوت اور الوہیت کا لاوا پھٹ پڑے .....
تمثالیت اور مشابہت کا ادراک ختم ہو جاتا ہے۔ یعنی سمبل خیال کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے کیوں کہ اس میں کثیر المعنویت ہوتی ہے .....

تو لوگوں نے جدیدیت کو فرسودہ ابلاغ اور پروپیگنڈے کے مقابل کھڑا کرکے اس میں ابہام، لایعنیت اور چیستاں تلاش کیا۔

افسانے کی واپسی کا ادراک درحقیقت اُن کی سمجھ کا ارتقاء تھا۔ وہ علامتی اور تجریدی اسلوب جنھیں وہ رد کرتے تھے، اُن کی سمجھ میں آنے لگا اور اسی لیے انھیں افسانوں کی واپسی نظر آئی۔ مگر ادعائیت کے سبب انھوں نے اپنی فہم و فراست کے ارتقاء کو ماننے کے بجائے افسانوں کی واپسی کا شوشہ چھوڑا۔

اگر ہم غور کریں تو افسانوں میں شعری زبان کا استعمال، کرونولوجی کو الٹ پلٹ کرکے جمالیاتی اور فکری سطح مہیا کرنا، علامتی اظہار کو فوقیت دے کر واقعہ نگاری،

جزئیات نگاری، کردار نگاری کو ثانوی حیثیت دینا، یہ سب عمل جو بیانیہ میں بھی رائج ہے، جدید فکر ہی کا نتیجہ ہے۔

صورتِ حال اب بھی وہی ہے۔ بلکہ ساختیات نے معاشرے پر بھر زور دیا اور زبان کو محض ذریعہ کے بجائے خود ادب قرار دیا۔ افسانہ لفظوں کی بنائی ہوئی کائنات پہلے بھی ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے۔ اب داخلیت، خارجیت یا ذات کے انکشاف وغیرہ کی بحث کی بجائے شعری زبان OSTERNENIE یا غیر مانوسیت، کردار کی فعالیت' اسلوب میں معاشرتی عکاسی، اور "کیا" لکھا ہے کے بجائے "کیوں اور کیسے" لکھا ہے پر زیادہ زور ہے۔

اس کتاب کے افسانوں میں جدیدیت، وجودیت، سرریلیت، ساختیات اور پس ساختیات کے ٹریسس ملیں گے۔ ایک زمانہ تھا جب ہم کہانی کو جذبات، ذات اور تجربے کا اظہارِ خیال کرتے تھے اور معاشرتی علوم، فلسفہ یا سائنس کے عناصر کو کہانی کے پورے امپیکٹ کے خلاف گردانتے تھے۔ لیکن اب ہمارے چاروں طرف فلسفہ، علوم، آئیڈیالوجی، سیاست، عمرانیات اور اسی طرح کے بہت سے عناصر پھیلے ہوئے ہیں اور ایک ادیب یا شاعر ان کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ ان عناصر نے فکشن کی سطح اونچی کرکے اُسے ELITE بنا دیا ہے۔ لیکن اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ ادیب چاہے وہ فکشن نگار ہو یا شاعر اپنی علمی اور ادبی سطح کو قارئین کے لیے نیچی نہیں کر سکتا، لیکن اُسے یہ یقین ضرور ہوتا ہے کہ قارئین کی علمی اور ادبی سطح بتدریج بلند ہوتی رہے گی۔ جدید افسانوں کے ساتھ یہی ہوا اور جو جدید افسانے چھٹی اور ساتویں دہائی میں چیستان معلوم ہوتے تھے، اب جمالیاتی فن پارے معلوم ہوتے ہیں۔

جہاں تک جدید ترین فکر کا تعلق ہے تو "میری" تخلیق کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ نہ "میں" ہوں اور نہ یہ تخلیق اوریجینل ہے۔ ہاں یہ پروڈکشن ضرور ہے اور اس کی بنیادیں انھیں فکشن کی شعریات میں ہیں جو ہر دور ادب کیا، دنیا کے ادب میں، ہزاروں سال پرانی ہیں مگر یہ لفظی اور معنوی کائنات میں اضافہ ضرور ہے کیوں کہ وقت کے ساتھ ساتھ اور

دوسرے معاشروں کے افلاک کے ساتھ ساتھ ہماری لفظی کائنات شعریات اور معنویت میں اَن دیکھا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ افسانوں نے اپنے کو لکھا ہے۔ مصنّف اور تخلیق کار نے دستخط کر دیے اور اب اس کا ان افسانوں سے کوئی تعلّق نہیں۔ یہ ناقدین اور قارئین کی امانت ہیں جو ان کے پروڈکشن کا جواز تلاش کریں، لفظوں کی کائنات کی بنیا دیں اور بلندی دریافت کریں، معنی پہنائیں، یا انھیں ڈی کنسٹرکٹ کریں اور گیپس تلاش کریں۔

فہیم اعظمی

# آخری موم بتّی

یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کب سے بیمار ہے۔ کسی نے اسے جسمانی طور پر بیمار کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہاں وہ اکثر بے محل باتیں کرتا تھا کہ اس کی ذہنی صحت پر شبہ ہونے لگتا تھا۔ مثلاً یہ کہ کتوں کی وفاداری پر بحث کرتے کرتے اپنی ہتھیلی پر گرڈل آف وینس دیکھنے لگتا تھا۔ علامہ اقبال کا شکوہ پڑھتے پڑھتے ایک دم چپ ہوجاتا تھا اور بُرش اَپ کرنے لگتا تھا۔ اور ہیر رانجھا کا قصہ سنتے سنتے اُٹھ کر کھڑا ہوجاتا تھا۔ فرائڈ کی ڈیتھ انسٹنکٹ (DEATH INSTINCT) سارتر کے اینگوئش (ANGUISH) اور ڈرننگ ٹیبل کی بات کرنے لگتا تھا، اور بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ عجیب عجیب حرکتیں کرتا تھا۔ کھانا کھاتے وقت اُٹھ کر دروازہ کھولتا تھا اور باہر جھانکنے لگتا تھا۔ گلاب کے پودوں کے پاس بیٹھ کر اُس کی شاخوں سے کانٹے اس احتیاط سے توڑنے لگتا تھا جیسے کسی نازک پیروں میں چبھے ہوئے کانٹوں کو نکال رہا ہو۔ ایک دن تو کمال ہی ہوگیا۔ افلاطونی محبت کی بات ہورہی تھی کہ وہ ایک دم سیڑھیوں سے دوسری منزل پر چلا گیا اور پورچ پر کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ سب کچھ پہاڑ پر ہوتا ہے۔ آگ نیچے نہیں روشن ہوسکتی اور بلادکاری میں آگے کا دامن تو چھپا ہوتا ہے۔ پکڑے گا بھی تو اوپر والے کے پیچھے کا۔ سب نے اس کو ایسی نظروں سے دیکھا تھا جیسے اسے کھا جائیں گے، اور وہ جو برآمدے میں نماز پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے تو لاحول بھیجا اور نیت توڑ کر اسے گالیاں دینے لگے، اور جلتے ہوئے گیس کے کنویں کی بشارت۔ اور وہ باہر نکل کر گٹر کے کنارے۔

بیٹھ گیا اور کاغذوں کے پلندے پر اپنی نئی کہانی کا عنوان لکھا۔

"THE LAST SWIM"

اور جب اُس کا کولیگ مجھے یہ باتیں بتا رہا تھا تو پاس والے لان پر ایک شخص جو مالی ہرگز نہیں تھا۔ لان کی ریشمی گھاس میں سے بدنما خودرو گھاس اکھاڑ کر پھینک رہا تھا اور اُسکا کولیگ کہہ رہا تھا۔

"اب تم ہی بتاؤ۔ اُس کو اس صحت مند برادری سے الگ تو کرنا ہی تھا۔ ورنہ تھوڑے دنوں بعد گلیوں میں نظر آتا اور بچے پتھر مارتے۔"

"لیکن اُسے مقیّد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس طرح تو وہ جسمانی طور پر بھی بیمار ہو جائے گا۔"

وہ جو اب تک بدنما خودرو گھاس چھانٹ چھانٹ کر ایک طرف انبار لگا رہا تھا۔ ایک دم سے مڑا اور بولا۔

"اجی کسی نے اسے مقیّد نہیں کیا۔ اس کی تو عجیب حرکتیں تھیں۔ کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے دیوار میں اپنی ایڑی سے ٹھوکر مارتا تھا۔ ایک دن اُدھر بھی۔ وہ دیوار ہے نا برآمدے کی۔ اُس میں ٹھوکر مار رہا تھا۔ میں نے کہا۔ بھئی اب تم باغ میں بھی ٹھوکر مارنے لگے تو بولا کہ یہی تو جگہ ہے جہاں ٹھوکر سے پانی نکالا جا سکتا ہے اور ایک بھلا سا نام لیا تھا۔ ہاں یاد آیا۔ پیگیسس (PEGASUS) پھر وہ زور سے ہنسا تھا اور بولا تھا۔ نہیں سمجھے۔ وہی پَر والا اور کھُر والا گھوڑا جس نے اپوکرین (HIPPOCRENE) سے پانی نکالا تھا۔ میں بھی وہی ہوں۔ دریا بہتا ہے میرے کمرے کی ہر دیوار سے اور وہ تیرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کون ؟ میلرڈ۔ سنہرے پر اور شرابی آنکھوں والی اور بھرے بھرے... اور یہ کہہ کر اس نے سامنے والی دیوار میں اس زور سے لات ماری کہ ساری انگلیوں سے خون نکلنے لگا۔

"دیوار گری"

"نہیں"

"پانی نکلا"

"نہیں"

"پھر"

"دیوار کا پینٹ اُکھڑ گیا۔"

"اتنی سی بات پر مقیّد"

"نہیں مقیّد کہاں کیا گیا۔ خود ہی ہو گیا۔"

"ڈیتھ انسٹنکٹ"

"جی"

"کچھ نہیں۔ تم نہیں سمجھو گے"

"جی بس خود ہی کھٹیا پکڑ لی۔ باہر ہی نہیں نکلتا۔ پوچھو تو کہتا ہے۔ باہر کیا ہے۔ تھوڑی جگہ زیادہ ہے۔ پھر دیوار اور بیکار۔ اُس پر ٹھوکر مار کر دھارا تو نہیں بہائی جا سکتی۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔ مگر پاگل سے کون بحث کرتا۔"

سائبان کی طرف سے دھم سے آواز آئی۔ شاید اس نے دیوار میں ٹھوکر ماری تھی۔ یا کہیں بلّی کودی تھی۔ وہ اپنے کتّے کے ساتھ ادھر بھاگا۔

میں نہیں جانتا کہ مجھے اس سے کیوں ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ عجیب طرح کی اُنسیت۔ ویسے بھی میں شہر سے باہر گھومتے پھرنے کا عادی تھا اور ان دنوں فصل بھی پک چکی تھی۔ وہ خوب صورت ہری ہری شاخیں اور پتّیاں زرد ہو چکی تھیں اور سوکھنے لگی تھیں۔ لیکن مجھے ان کی زردی ان کی پہلے کی ہریالی سے زیادہ اچھی لگتی تھی۔ میں یہ بات کسی سے بتاتا نہ تھا۔ خود ہی غور کرتے کرتے ایک دن سو رہا تھا کہ یوں لگا جیسے میں دو کھیتوں کے بیچ کھڑا ہوں۔ ایک کچّی فصل والا اور دوسرا پکّی فصل والا۔ چڑیوں کا غول کہیں سے آیا۔ ہرے بھرے کھیتوں میں بیٹھا لیکن چند لمحے کے بعد وہ چڑیئیں اڑیں اور پکّی فصل والے کھیت میں بیٹھ گئیں پھر یوں ہوتا رہا کہ چڑیئیں قطار در قطار آتی تھیں اور پکّی

فصل والے کھیت میں بیٹھتی تھیں۔ پھر پیٹ بھر کر چلی جاتی تھیں۔ یکایک کھیت کاٹنے کے لیے ٹریکٹر آیا اور اس میں سے ایک آدمی نے پکار کر کہا۔

"ادھر سے شروع کرو۔ صفائی سے کاٹنا۔ بڑی اچھی فصل ہے۔ بھرے بھرے دانے۔"

"اور وہ دیکھو" کسی نے ہرے کھیت کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں ابھی تک ٹھیک ہے۔ دیکھو ابھی تو بڑے مرحلے ہیں۔ اولے۔ پالے ہوا۔ سیلاب۔ یہ تو اب بچ گئی نا۔ دیکھو کتنے بھرے اور موٹے دانے نکلیں گے کاٹنے کے بعد۔ بس رج گئے استاد۔"

میری آنکھ کھلی تو پہلے ہنسی آئی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر کپڑے پہن کر باہر نکل گیا۔ میں نے اس کے مکان میں روشنی دیکھی۔ اتنی رات گئے عموماً اندھیرے مکان میں روشنی دیکھ کر کچھ خوشی ہوئی اور کچھ ڈر لگا۔ سوچا شاید وہ اچھا ہوگیا ہو۔ شاید وہ۔۔۔۔

اب وہ پاگل گھر کے اندر ہی رہتا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ گھر میں کوئی اور نہ تھا۔ ویسے بھی اب اس کی صحت گر چکی تھی کہ لوگ اُسے چند دنوں کا مہمان سمجھتے تھے۔ اس کے گھر میں اندھیرا رہتا تھا کیوں کہ اب اُسے روشنی کی ضرورت بھی نہ تھی۔

اور جب میں نے یہ غیر معمولی بات دیکھی یعنی روشنی، تو میں اپنے کو روک نہ سکا۔ اس وقت آسمان پر دو ستارے جسے گاؤں کے لوگ کچپچیا کہتے ہیں چمک رہے تھے۔ میرے علم کے مطابق ان میں ایک یقیناً وینس تھا اور دوسرا نام نہیں معلوم۔ لیکن سورج سے بہت دور ہوگا۔ رات کافی گزر چکی تھی اور کچھ ہی دیر میں صبح ہونے والی تھی۔ میں اس کے گھر کے قریب چلا گیا۔ ایک کھڑکی کھلی تھی جس میں سے روشنی آرہی تھی۔

"اب میرے جلنے کا وقت ہو رہا ہے"

"تم آتی کیوں ہو روز؟ موم بتی جلا کر بیٹھی رہتی ہو اتنی دیر"

"اور کیا کر سکتی ہوں۔ تھوڑی سی روشنی ہو جاتی ہے۔ تمہاری باتیں سن

لیتی ہوں اور سمجھ لیتی ہوں"

"لیکن تم یہ روشنی کیوں کرتی ہو؟ یہ روشنی تو مجھے سانس لینے پر مجبور کرتی ہے۔ اب ان سانسوں کو کس کو ضرورت ہے؟"

"میں اس کا جواب کیا دوں، بس مجھے ہے"

"اور تمہاری اپنی سانسیں"

"وہ تو ہیں مگر سب کو ہم نفسی کی ضرورت ہوتی ہے"

"مگر تمہاری سانسیں اکیلی تو نہیں ہیں"

"نہیں۔ مگر OUT OF RHYTHM ہیں۔"

"تو یہاں؟"

"اسی لیے تو موم بتی جلاتی ہوں"

"کب تک؟"

"آخری RHYTHM یا آخری موم بتی تک"

اور اس کے بعد اُفق۔ بادل۔ دھنش۔ سندھ۔ راوی۔ غالب۔ بائرن۔ ارسطو اور ارستوفینیز کی باتیں ہوئیں۔ مگر افلاطون کا ذکر نہ آیا۔ ساری سچی باتیں تھیں۔

میرا کولیگ آج بہت خوش تھا مجھے دیکھا تو دوڑ کر میرے پاس آ گیا۔

"ایک خوش خبری سنو"

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"وہ ٹھیک ہو گیا۔

میں اپنے کولیگ کو غور سے دیکھتا رہا اور خاموش رہا۔

"ارے بھئی وہ جو چوتھی گلی والے مکان میں رہتا تھا۔ وہ پاگل جو پڑلوک سدھار رہا تھا"

میں نے ہنس کر کہا "اچھا اچھا"، جیسے مجھے اس خبر میں کوئی خاص دلچسپی نہ ہو۔ میرا دوست مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اسے تعجب ہو رہا ہو کہ میں اتنی ہمدردی جتانے کے

بعد اتنی بے دردی کا مظاہرا کیوں کرنے لگا تھا۔ اُسے کیا معلوم کہ جس خبر کو وہ سُنا رہا تھا اس کی تفصیل مجھے معلوم تھی۔

اب اسے کوئی پاگل نہیں سمجھتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی تبدیلی آ گئی تھی بلکہ اس لیے کہ لوگوں کا غیر منطقی مفروضہ تھا کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ اس کی جو بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اسے بھی غور سے سُنتے تھے اور اُسے اپنے طور پر معنی پہناتے تھے۔ مگر وہ سب اسے دن کی روشنی میں دیکھتے تھے۔ رات کے اندھیرے میں اُسے کسی نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اسی اندھیرے گھر میں رہتا تھا، اور یہ بات صرف مجھے معلوم تھی کہ بڑی رات گزرنے کے بعد اس کے گھر میں روشنی ہوتی ہے اور دو سانسوں کی RHYTHM مل جاتی ہے۔

ایک بار میں نے خود اس سے کہا تھا۔

"یہ اندھیرے میں کیوں رہتے ہو؟"

"اندھیرے میں کہاں رہتا ہوں؟"

میں نے اندھیرے اور روشنی کے موضوع پر اور بات نہ کرنا چاہی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں اس کے نجم ساطع کا راز جانتا ہوں۔ میں نے دوسرا سوال کیا۔

"ہمیشہ تنہا رہتے ہو؟"

"میں تنہا کہاں رہتا ہوں ....؟"

میں پھر خاموش ہو گیا لیکن اس نے خود ہی جملہ پورا کیا۔

"تنہا تو باہر نکل کر ہوتا ہوں"

میں نے اس بارے میں پھر اُس سے کوئی بات نہ کی۔

ایک عرصے کے بعد آج میں۔ اُس کے گھر کے پاس سے گزرا تو دروازہ اور کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ مدھم سی روشنی اس کے گھر کے اندر سے آ رہی تھی مگر اس کے سائے بڑے ناہموار تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ روشنی کھڑکی سے آتی ہوئی ہوا کے جھونکے کے زیرِ اثر سمت

میں جھک رہی ہے۔

میں ایک کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"یہ آخری موم بتّی ہے۔ کھڑکی دروازے کھول دیے ہیں، اب انھیں بند کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اور تم؟"

"میں، بھٹکتی رہوں گی۔"

"مگر سانسیں"

"اکیلی اور بغیر ردھم کے"

"اب کبھی ملیں گے"

"شاید انٹارٹیکا میں۔ سنتے ہیں وہاں دیواریں نہیں ہیں۔"

"فی الحال۔ کیوں کہ دیوار بنانے والے نہیں پہنچے۔"

"بھڑک۔ آخری آہنگ۔ آؤٹ آف ٹیون۔"

○

تخلیق غیر ارادی ہوتی ہے۔ لاشعور کی خواہشات اور طراز البدی تمثال اس کو نمو اور جلا دیتے ہیں۔ اس لئے یہ نہ منطقی ہوتی ہے اور نہ نیچر کی عکاسی کرتی ہیں۔ خیالات، حادثات، احساسات کے تلازمے سے جو پیکر بنتا ہے وہ نہ کرونولوجی کو جانتا ہے اور نہ کسی زمانی ومکانی سلسلے کو۔ اجتماعی شعور اس پیکر کو لازمانی اور لامکانی ہیئت عطا کرتے ہیں۔ خواب کی طرح تخلیق میں بھی لاشعور کا لسانی نظام تصوّر اور واہمہ میں فرق نہیں کرتا۔

# بے موسم کا پھول

باہر دھوپ تیز تھی۔ سایہ تھا مگر اُس سے دور، درختوں کے پتّے زرد، جھاڑیاں کچھ سوکھی اور سفید اور کچھ ہرے پتّوں سے ڈھکی ہوئی تھیں لیکن وہ بھی سوکھنے اور سفید ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔ سوکھے پتوں کے اندر بہت کچھ تھا۔ سایہ، ہریالی، تر و تازگی، خوشبو، مگر ان کے اندر کون جھانکتا ہے۔ سب اوپر دیکھتے اور چلے جاتے تھے۔ انھوں نے تو ٹکسٹ بک پڑھی تھی۔ بوٹنی (BOTANY) کی ظاہری باتوں کو جانتے تھے۔ اوپر سے دیکھتے تھے اور سمجھ جاتے تھے کہ پودے مرچکے ہیں اور ان کا دوسرا جنم صرف رُت بدلنے کے بعد ہی ممکن ہے۔

وہ یہی سوچتا ہوا دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اُسے ایک پودا نظر آیا۔ اسے ایسا لگا کہ جیسے وہ آواز دے رہا ہو "میرے قریب آؤ۔ میں بھی تمہاری طرح ہوں۔ رُت گزر چکی ہے، لیکن میں اب تک اس کے اثر میں ہوں۔ دیکھو میری ہری پتّیاں اور میرے پھول۔ کیا خیال ہے؟"

وہ پودے کے قریب چلا گیا اور اسے غور سے دیکھا۔ اُسے یہ جاننے میں دقّت ہو رہی تھی کہ یہ کون سا پودا ہے۔ اُس کے ساتھ پودے کی ایک صنف کو منسلک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کبھی اس کی پتّیاں گلاب جیسی نظر آتی تھیں، کبھی موتیا جیسی، کبھی کیکٹس کے اندر سے پُرآب اور اوپر سے سوکھے پتّے کا گمان ہوتا تھا۔ کبھی نرگس کی خود پسندی نظر آتی تھی، کبھی زینیا کی ہر دل پسندی۔ پھر اُس نے اُس کی شاخوں کو دیکھا ایسا لگتا تھا۔

کہ اُن پر دھوپ کا کوئی اثر نہ تھا۔ ہری بھری، نازک، سیدھی، لہراتی ہوئی صاف اور شفاف۔ پھر اُس نے اس میں لگے ہوئے پھولوں کو دیکھا۔ کوئی پھول مکمل نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی پنکھڑیاں ایک دوسرے سے الگ ہو چکی ہیں، اور ان میں یک رنگی بھی نہ تھی۔ کچھ پنکھڑیاں گلابی، کچھ چمپائی، کچھ ہارسنگھاری، کچھ سوسنی کچھ نرگسی اور کچھ آدھی سرخ اور آدھی سفید۔ اس نے اپنی آنکھیں ملنی شروع کیں۔ اور ہر بار آنکھیں مل کے پودے، پتّوں، شاخوں اور بکھرے ہوئے پھولوں کو غور سے دیکھتا رہا لیکن ان میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ بس ایسا لگتا تھا کہ کوئی آواز اس کے کانوں میں آرہی ہے جیسے کوئی کہہ رہا ہو ـــــ "ہاں، ہاں۔ تم صحیح جگہ پر آگئے ہو۔ ہم خود تمہارے قریب آنا چاہتے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ تم مرجھائی ہوئی جھاڑیوں سے ڈرو گے نہیں۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کوئی تمہارا منتظر ہے۔ قریب آؤ۔"

اُسے ہنسی آگئی اور اس کے غیر منطقی خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اس نے سوچا یہ آواز، اور ہر طرف خاموشی تھی۔ اُس نے سوچا "یہ پودا" اور اسے اپنے چاروں طرف پودے دکھائی دیے، موسم زدہ، بے آب، جھلسے ہوئے، بے پھل، بے پھول۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ کسی نے اسے پیچھے سے آواز دی "دیکھو منطق کی دنیا میں یہی ہوتا ہے۔ مگر جو تم دیکھ رہے ہو وہ حقیقت نہیں ہے۔ یہ منظر نقلی ہیں۔ اس کے پیچھے کی حقیقی دنیا کو دیکھو جو زندہ ہے، اور جس پر موسم کا اثر کبھی نہیں ہوتا۔

ایسا لگا جیسے غیر شعوری طور پر اس کے نطق میں کسی نے الفاظ بھر دیے ہوں۔

"لیکن اس پر تو موسم کا اثر ہے"

"ضرور ہے۔ مگر تم جو آگئے!"

"میں کیا کروں؟"

"اسے سیراب کرو"

اس کے قدم رک گئے جیسے کسی جادوگر نے خطِ حصار کھینچ دیا ہو۔ وہ اس سے

نکل نہیں سکتا تھا۔ وہ پودا پھر اس کے سامنے تھا۔ بالکل پہلے کی طرح، کئی رنگ کا کئی روپ کا۔ وہ اسے کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی صنف شاید اس کے علم میں ایک نیا اضافہ تھا۔ لیکن اس کے احساسات پر وہ آخری جملہ چھایا ہوا تھا۔ اسے سیراب کرو۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک طرف چل پڑا۔ جھاڑیوں، اور درختوں کے جھنڈ سے نکل کر وہ ایک پگڈنڈی پر آ گیا۔ بہت ہی ناہموار پگڈنڈی جسے لوگ عرصے سے استعمال کر رہے تھے لیکن کسی کو اس کے گڑھے اور ٹیلے پاٹنے کی توفیق نہ ہوئی تھی۔ ابھی وہ پگڈنڈی کی ناہمواری، بے نام پودے کی سیرابی اور اپنی غیرارادی جستجو کے بوجھ تلے اپنی وجود کی فکر میں مبتلا تھا کہ کہیں سے آواز آئی۔

"کے سَرا سَرا"

وہ وہیں رک گیا۔ اس نے پھر غور سے سنا۔ عجیب درد تھا اُس آواز میں۔ اس نے سوچا، یہ تو بہت پرانی آواز ہے۔ ہزاروں سال پرانی۔ شاید خطِ استوا پر کھڑے ہو کر پہلے آدمی نے آسمان کو دیکھا تھا اور یہی آواز دی تھی۔ جب سے یہ سینہ بہ سینہ، کتاب بہ کتاب، صحیفہ بہ صحیفہ، داستان بہ داستان، کہانی بہ کہانی، فلم بہ فلم، تاریخ یہ تاریخ سنائی دیتی رہی ہے۔ یہ کلیشے ہے مگر ایسا کلیشے جسے انحرافی اور انقلابی بھی ختم نہ کر سکے۔ اس لیے کہ یہ آدمی کے وجود کا حصّہ ہے۔ ایک کاتیجنسی وہ اس آواز کی سمت کھنچتا چلا گیا۔ اُسے پگڈنڈی کے کنارے ایک آدمی نظر آیا۔ موسم گزیدہ، مردم رمیدہ، دل کبیدہ، رُوگشیدہ۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا اور اس کے منہ سے وہ کلیشے نکل رہا تھا، "کے سَرا سَرا"

"کون ہو تم؟ کیا میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں"

اُس نے سر اٹھا کر غمگین نگاہوں سے دیکھا۔

"پہلے تمہارے دوسرے سوال کا جواب۔ نہیں"

"اور پہلے سوال کا!"

"تم کیوں جاننا چاہتے ہو؟"

"بس یونہی۔ فطری تجسّس، ہم دمی، ہم آہنگی۔ تم آدمی ہونا"

"ہاں۔ اب تو آدمی ہوں"

"اب کیوں؟"

"پہلے کچھ اور تھا اور آدمیت کی سرحد کے باہر چلا گیا تھا، اور لافانی ہونے کی خواہش تھی"

"یہ تو کوئی بات نہیں۔ ہر آدمی میں یہ خواہش ہوتی ہے"

"وہ کیسے؟"

"نسل کشی، آواگون، سورگ یا شیت، اوراق، الفاظ، امر کہانی، کچے گھڑے، ریت کا طوفان، انا الحق، شہادت، جن، بھوت، پریاں، سانپ کی سوسالہ زندگی، شب برات کا حلوہ، تاج محل، مقبرے اور کیا کیا بتاؤں تمہیں؟"

"میرا طریقہ دوسرا تھا۔ ڈائرکٹس ایکٹس (DIRECTUS ACTUS)

"یہ کون سی زبان ہے؟"

"لاطینی"

"تمہیں لاطینی آتی ہے؟"

"اگر نہ آتی تو میں، کے سراسرا، کیسے کہتا"

"وہ تو کلیشے ہے"

"نہیں اس کی دائمی افادیت ہے۔ کاٹاما اس آئے۔

"(KTEMA ES AEI)

"اور یہ کون سی زبان ہے؟"

"یونانی"

"تمہیں ساری زبانیں آتی ہیں؟"

"ہاں۔ اسی لیے میں امر ہونا چاہتا تھا"

"اچھا اب بتاؤ۔ کون ہو تم؟"

"سکندر ذوالقرنین"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور ایک طرف کو جانے لگا۔ پھر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"اور تم کون ہو، اور کہاں جا رہے ہو؟"

"دوسرے سوال کا جواب پہلے اور پہلے سوال کا جواب ضروری نہیں کیونکہ میں ایک معمولی آدمی ہوں اور امر بننا نہیں چاہتا۔ میں ۔۔۔۔۔"

"میں جانتا ہوں۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔ تمہیں بھی وہی چاہیے الکزیر (ELIXIR)"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"تم پہلے بتاؤ۔ مٹی کو سونا بنانا ہے؟"

"نہیں بے موسم کے پھول کھلانا ہے"

"اچھا تم اس پگڈنڈی کے پار درختوں سے ہوتے ہوئے پہاڑی کے نیچے اتر جاؤ۔ مگر سنو۔ جب میں نہیں حاصل کرسکا تو تمہیں کیسے ملے گا؟"

"تم کو تو اپنے لیے حاصل کرنا تھا نا۔ میں تو دوسروں کے لیے لینے جا رہا ہوں۔ مجھے ضرور ملے گا۔ بس تم نے راستہ بتا دیا۔ تمہارا شکریہ!"

کے سَرائسَرا، کی ایک اور دلگیر آواز آئی، وہ پگڈنڈی پار کر چکا تھا اور ایک خوب صورت جھیل کے کنارے کھڑا تھا۔

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جانی پہچانی زمین، جانی پہچانی فضا۔ پھر اُسے جھاڑیوں کے اوٹ سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ بہت ہی سریلی آوازیں۔ لیکن اُسے ان آوازوں سے کیا کام۔ وہ تو اس وقت ایک مقصد کا اسیر تھا اور جمالیات کی متنوع شکلوں کو پہچاننا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جھیل سے پانی نکالا اور چلنے ہی والا تھا کہ اسے کئی خوب صورت لڑکیاں نظر آئیں جو اس کی راہ میں حائل تھیں اسے دیکھ کر انھوں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا اپنی گھبراہٹ

کو چھپانے کے لیے اس نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔

"وہ جنگل ہے نا پہاڑی کے اس طرف۔ وہاں ایک پودا ہے۔ میں اس جھیل سے پانی لینے آیا تھا۔ اس پودے میں پھول کھلانے کے لیے"

لڑکیوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ پھر سب نے ایک ساتھ ہنسنا شروع کیا۔ ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"میں تمہارے قریب آجاؤں"

"مگر کیوں؟ کیا یہ جھیل تمہاری ہے؟"

"ہاں۔ مگر کوئی بات نہیں۔ اس جھیل سے بہت سے لوگ پانی لیتے ہیں۔ مگر لوٹ کر کوئی نہیں آتا"

"مگر میں تو پھر آؤں گا۔ مجھے پھول جو کھلانے ہیں۔ اُس جنگل میں جو پودا ہے نا۔۔۔۔"

"یہاں کوئی جنگل نہیں ہے۔ تمہیں دھوکا ہوا ہے۔ یہاں تو سب باغ ہی باغ ہیں"

"مگر وہ پودا۔ اس میں پھول کھلانے ہیں"

"مگر موسم تو گزر گیا"

"مگر مَیں بے موسم کا پھول کھلانا چاہتا ہوں"۔ اس نے مَیں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اس لڑکی نے پھر دوسری لڑکیوں کی طرف دیکھا اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"میں تمہارے قریب آجاؤں"

"آجاؤ۔ مگر مجھے بے موسم کا پھول کھلانا ہے۔ اس لیے۔۔۔۔"

"اسی لیے تو میں تمہارے قریب آنا چاہتی ہوں۔ میں اسی کو پسند کرتی ہوں۔ جو مجھ سے دور جانا چاہتا ہے۔ کیوں کہ یہ روٹین نہیں ہے"

"اچھا آجاؤ۔ مگر مجھے جانا ہے۔ اس پودے میں پانی دینے کے لیے"

"ضرور جاؤ۔ یہ بھی روٹین نہیں ہے۔ بے موسم کا پھول کھلانا روٹین سے انحراف ہے اور اسی لیے میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔"

لڑکی قریب آگئی تھی۔

"تم آؤ گے نا؟"

"ویسے میں عام طور سے بھیڑ سے گھبراتا ہوں۔ مگر اس جھیل پر ضرور آؤں گا۔ سکندر ذوالقرنین نے کہا تھا کہ یہ آبِ حیات ہے۔ مگر تم لوگ کون ہو اور یہ کون سی جگہ ہے؟"

"یہ تو تمہیں بعد میں معلوم ہوگا۔ جب پھول کھل جائے تو یہاں ضرور آنا۔ میں تمہیں یہیں ملوں گی۔ اسی جھیل کے کنارے۔"

"تم پانی نہیں پیو گے؟"

"نہیں۔ میں امر نہیں بننا چاہتا۔ میں تو اس بے موسم کے پھول کو امر بنانا چاہتا ہوں۔"

وہ پانی لے کر پودے کے پاس آیا اور اس میں پانی ڈالے۔ وہ روز جھیل پر جاتا تھا اور پانی لاتا تھا مگر اسے وہ لڑکی پھر نہ دکھائی دی، اور جب اس پودے میں پھول کھلا تو اس میں طرح طرح کے پھولوں کا رنگ تھا، ایسا پھول جو کسی ایک نام سے نہیں جانا جا سکتا تھا۔ وہی گلابی، چمپئی، سوسنی، نرگسی، زینیا اور کنول کی ملی جلی پتیاں اور رنگ۔ بالکل نرالی تخلیق۔ اسے یاد آنے لگا کہ اس نے کہا تھا۔

"پھول کھلنے کے بعد صرف خواب نہ دیکھتے رہ جانا۔ یاد رکھنا تمہیں واپس آنا ہے۔ عمل کرو گے نا، اپنے وعدے پر؟"

"ہاں وعدہ۔ اس کی زبان سے خود بخود نکلا۔ میں وعدہ ضرور پورا کرتا ہوں۔"

وہ پھر جھیل کے کنارے کھڑا تھا۔ بہ رسم سے اگایا ہوا بے موسم کا پھول اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے۔

اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ پھر جھیل کے پانی میں موجوں کے

اُبھرنے کی آواز آئی۔ وہ ساحل پر آگئی۔

"تم جل پری ہو؟"

"نہیں صرف پری ہوں۔ جل اور تھل میرے لیئے دونوں برابر ہیں"

یہ کہہ کر وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں چلی گئی اور جب وہ پھر سامنے آئی تو اس کے بے موسم کے پھول کی طرح اس کے جسم پر کئی رنگ کے کپڑے تھے۔ ان رنگوں کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ ہرا، آسمانی، نیلا۔ اور وہ بہت خوب صورت نظر آرہی تھی وہ قریب آگئی۔

"پھول لائے ہو"

"ہاں۔ دیکھو نا۔ یہ جھیل کے اَمر جل سے سینچے ہوئے پودے کا پھول ہے۔ تم جانتی ہو اس کا نام؟"

"اس کا کوئی نام نہیں، یہ اَمر پھول ہے"

ایک لمحے کے لیے خاموشی ہو گئی۔ وہ ہنستی رہی اور کچھ کہتی رہی۔ اس نے کچھ نہ سُنا۔ صرف اسے دیکھتا رہا۔ اس نے کہا۔

"کہاں کھو گئے؟"

اور اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی گہری نیند سے جاگ گیا ہو۔

"ہاں۔ یہ پھول"

"اسے میرے جوڑے میں لگا دو"

"مگر تمہارے جوڑے میں پہلے ہی پھول لگا ہوا ہے"

"ہاں۔ مگر یہ روٹین ہے۔ موسم کا پھول جسے میں عادتاً لگاتی ہوں۔ تمہارا پھول نیا ہے اور بے موسم کا۔ بے نام۔ اَمر پھول"

"مگر تمہیں کیوں پسند ہے؟"

"اس لیے کہ ہم سب روٹین سے ہٹنا چاہتے ہیں۔ جدّت کے خواہاں ہیں۔ مگر ہم اپنے آپ سے جھوٹ بولتے ہیں۔ ہمارے اوپر برسوں کا بوجھ ہوتا ہے رشتوں

کا، دولت کا، آسودگی کا، منطق کا، معاشرے کا۔ اور سچ اس کے نیچے دبا ہوتا ہے۔ جھوٹ کا سہارا ضروری ہوتا ہے۔ موسمی باتیں، موسمی کپڑے، موسمی پھول ہماری زندگی کی روٹین ہے اور میں۔ میں تمہاری روٹین توڑنا چاہتی ہوں۔ بے موسم کا پھول لگا کر۔"

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

وہ ہنسی۔ بہت ہی دلفریب اور دلکش ہنسی۔ اس میں طنز بھی تھا اور پیغام بھی، نئی رُت کا پیغام۔ پھر اس نے کہا۔

"میرا نام مونیکا ہے۔"

"مونیکا۔ جس نے وشوامتر کی تپسیا خراب کی تھی۔"

"وشوامتر کی تپسیا خراب ہونے کی کہانی جھوٹی ہے۔ پریم تپسیا کو سپھل کرتا ہے، اُسے خراب نہیں کرتا۔ آؤ۔ میرے جوڑے میں پھول لگا دو۔"

"اور جب وہ پھول لگانے کے لیے بڑھا تو اس کے ہوش و حواس باقی نہ رہے۔ بجلی چمکی پھر بارش ہوئی۔ آبِ نیساں کی پہلی بارش جو جھیل کی سیپوں میں گئی اور اس کا منہ کھل گیا۔ اس میں سے موتی جھانکنے لگا، اور وہ بانس میں گئی اور بنس لوچن پیدا ہوا اور خوشبو پھیلی۔ اس نے کہا۔

"تمہیں شکنتلا چاہیے؟"

"نہیں۔ مجھے صرف مونیکا چاہیے۔"

وہ پھر پودے کو پانی دے رہا تھا۔ اس نے بے موسم کے کئی پھول کھلائے اور جھیل کی طرف گیا مگر راستے مسدود ہو چکے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ پہاڑی بہت اونچی ہو گئی ہے۔ وہ اُس پر سے گزر نہیں سکتا تھا۔ وہ واپس آ گیا اور پھر نجانے کہاں گیا۔ ایک دردناک آواز جنگل اور وادی میں صدیوں تک گونجتی رہی۔

"کے سرا سرا"

لیکن اُسے سننے والا کوئی نہ تھا۔

ارتقا اور تطور کے عمل میں ہم کچھ کھوتے ہیں اور کچھ پاتے ہیں۔ حیاتیاتی
تطور میں کھونے کا عمل ڈارون کے مطابق عدم استعمال کا نتیجہ ہوتا ہے اور
پانے کا عمل استعمال کا۔ انسانی تہذیب کے تطور میں آبادی میں اضافہ
اقتصادی حملہ اور خلط ملط، مادی ضرورت اور اس کی تکمیل میں کمی بیشی غرض
کہ زیادہ تر خارجی عوامل پرانے اقدار کی توڑ پھوڑ کرتے ہیں۔ کہنے کو تو ہر نئی
قدر درایت پر مبنی ہوتی ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا اکثر بہت مشکل ہوتا ہے
کہ روایت کی سطح اونچی ہوتی ہے یا درایت کی۔

# کچھ کھویا کچھ پایا

میں ایک کونے میں کھڑا تھا اور اِساس کی مورتی کو دیکھ رہا تھا اور قدیم یونانیوں کی تخلیقی صلاحیتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جنھوں نے اپنی ہر مادی اور روحانی ضرورت کے لیے اپنے فطری لیکن منطقی ذہنوں سے دیوتاؤں کو جنم دیا اور انھیں کردار کے مطابق صورت بھی عطا کردی، اور یہ معصوم صورت محبّت کے زخم کی خالق ٹھہرائی گئی۔ ایک ایسا زخم جو کبھی نہیں بھرتا۔ سڑک کے موڑ سے ایک خاتون اِساس جیسے معصوم صفت کو اپنی کوکھ میں لیے ہوئے نمودار ہوئیں۔ اُن کے ایک ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چل رہی تھیں۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ ان کی سست رفتاری کا سبب ان کا اپنا وزن تھا یا سوٹ کیس کا بوجھ، یا شاید دونوں وجوہات یکجا ہونے سے وہ زیادہ تیز نہیں چل سکتی تھیں۔ ایک لحیم شحیم باوردی پولیس کا سپاہی سڑک کے دوسری جانب کھڑا تھا۔ اس عورت کو دیکھتے ہی اس نے سڑک پار کی اور قریب آکر بڑے مہذّب انداز میں بولا۔

"آپ کو کہاں جانا ہے؟"

خاتون نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا اور پولیس والے نے کچھ کہا۔ سڑک کے شور کی وجہ سے میں ان کی گفتگو نہ سُن سکا۔ میں نے دیکھا کہ پولیس والے نے خاتون کا بکس اپنے ہاتھ میں لیا اور ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بکس ہاتھ میں نہ ہونے کی وجہ سے خاتون کی چال پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی تھی لیکن یقیناً اتنی تیز نہیں کہ وہ پولیس والے

کے ہم قدم چل سکتیں۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ پولیس والا ارادتاً خاتون کے ساتھ قدم ملا کر چل رہا تھا۔ میں حدِّ نظر تک ان کو ساتھ جلتے دیکھتا رہا اور چونکہ فٹ پاتھ بالکل سیدھا تھا۔ مجھے کافی دور تک دونوں ایک ساتھ چلتے نظر آئے۔

اپنے ماحول اور معیار کے مطابق مجھے فوراً خیال آیا کہ یہ پولیس والا بھی اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر کیوں چلا گیا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کیوں کہ میرے مشاہدے اور تجربے کے مطابق پولیس والا اپنی چوکی یا اپنی متعین جگہ سے ہل ہی نہیں سکتا، چاہے اس کے دائرۂ فرض سے آگے کوئی حادثہ ہی کیوں نہ ہوا ہو۔ جب میں نے اس واقعے کا ذکر ایک دوست سے کیا اور پولیس والے کے اس فعل پر کہ وہ اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر ایک عام عورت کا سوٹ کیس اٹھا کر اتنی دور تک اس کے ساتھ گیا، تعجب کا اظہار کیا تو میرے دوست نے کہا۔

"تمہارا خیال غلط ہے۔ اس نے اپنی ڈیوٹی نہیں چھوڑی بلکہ اپنا فرض انجام دیا"

اور میرے مزید استفسار پر میرے دوست نے بتایا کہ یہاں کے پولیس والوں کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ اگر وہ کسی حاملہ عورت کو اس طرح سوٹ کیس یا کوئی وزنی چیز لے جاتے دیکھیں تو اسے خود لے کر حاملہ عورت کو بحفاظت منزل تک پہنچا دیں۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب موسم میں نظام اور اعتدال تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ جس سین کا میں نے اوپر ذکر کیا۔ اس کے گرد اروں کے چاروں طرف کے درخت پرانے ہو گئے تھے۔ پھلوں اور پھولوں کے نام بھی پرانے تھے اور نئی زبان ابھی پوری طرح رائج نہیں ہوئی تھی۔ پارکوں اور باغوں کے درختوں کے موٹے موٹے تنے اپنی پرانی عظمت کی آیت ضرور تھے مگر اب ان کے رنگ زیادہ رمادی ہونے لگے تھے۔ لوگوں کے پاس اتنا وقت نہ تھا اور نہ اتنا سبھاؤ کہ وہ ان کے سامنے کھڑے ہو کر ان کی خوشنمائی اور فردتنی کا قصیدہ پڑھیں۔ لوگ ان کے بیچ سے اس طرح گزر جاتے تھے جیسے مانوس لوگ چھانگا مانگا اور سندر بن کے جنگلوں میں سے گزر جاتے ہیں پہلے تو جنگل میں رہنے والے شیروں، چیتوں اور بھیڑیوں کا ڈر تھا۔ پھر چیتے، شیر اور بھیڑیے کم ہو گئے، لیکن ڈر باقی

رہا۔ لیکن اب اس دھرتی کو روندنے والے شیروں اور چیتوں سے آنکھیں چار کرتے ہیں جھاڑوں میں سانپ اور بچھو اب بھی تھے جو شاید برسوں کی برتری کے نلطے اپنے پھن اور ڈنک کا استعمال چھپے چوری یا ڈپلومیٹک طریقے سے کرتے تھے۔ لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں تھا کہ آریزز (ARES) نے اپنا بوریا بستر سنبھال کر چھوٹے چھوٹے علاقوں میں بسیرا کر لیا اور یہاں امن وامان ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ بوڑھے اور پروقار درختوں کا کیا حشر ہوا۔ وہ سوکھ کر گر گئے یا لوگوں نے ان کی لکڑیاں کاٹ کر جلا ڈالیں۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ دیمکوں نے اپنا انتقام بھی ضرور لیا ہوگا۔ کیوں کہ اب تو تارکول بھی اتنا سستا نہ تھا کہ وہ ہر موٹے درخت کو دیمکوں سے بچانے کے لیے ان کے تنے میں لگایا جاسکے اور شاید گھوڑے، سائیس اور اصطبل کی طرح مالیوں کی تعداد بھی گنی چنی رہ گئی تھی۔ لوگوں کو چھوٹے چھوٹے فلیٹوں سے نکل کر درختوں کی دیکھ بھال کرنے کا موقع بھی نہ ملتا تھا۔ بڑے بڑے عالیشان محل جن کے احاطے میں بڑے بڑے باغ تھے اپنی افادیت کھو چکے تھے کیوں کہ ہاتھورن کے ہاؤس آف سیون گیبلس کی طرح ان پر بھی بھوت پریت کا قبضہ تھا اور ان کی وارث بوڑھی عورت صرف بچوں کی مٹھائی اور کھلونوں کی چھوٹی سی دکان اور محل کے ایک کونے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ مجھے ایک دم سے خیال آیا کہ اس حاملہ عورت کا بیٹا جس کا ذکر میں نے اپنی کہانی کے شروع میں کیا تھا۔ اب بیس سال کا ہوگا۔ پھر میں نے سوچا۔ کیا اس کی ماں نے اسے یہ بتایا ہوگا کہ جب وہ پیٹ میں تھا تو اس زمانے کے رواج کے مطابق پولیس والے کا کیا فرض تھا شاید نہیں۔ اس لیے کہ اگر بتا بھی دیتی تو یہ اس کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی۔ شاید وہ اس بات پر ہنس دیتا۔ اس لیے کہ سبھی پرانی قدروں پر ہنستے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ سوچتے سوچتے مجھے ایک دم خیال آیا کہ شاید اس وقت پولیس والوں کے پاس وقت زیادہ تھا اور کام کم۔ مگر مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ کام تو شاید اب کم ہونا چاہیے۔ اور میں کمپیوٹر، فوٹو سٹیٹ مشین، ٹلکس فیکسیملی، اور راڈار کے بارے میں سوچنے لگا۔ اب سب کام کرنے والے ذرائع ہیں تو شاید آبادی

کے تناسب سے زیادہ ہی اضافہ ہوا ہوگا۔

شاید میں یہ سب کچھ نہ سوچتا اگر مجھے بیس سال پہلے والا واقعہ نہ یاد آ گیا ہوتا۔ اراس کی صورت اب بھی اسی جگہ تھی جہاں میں نے اُسے پہلے دیکھا تھا۔ اونچی اونچی عمارتوں نے، ان پر سے گزرنے والے کہرے نے اور گہرے بادلوں نے قرب و جوار کے دھندلکے کو برقرار رکھا تھا۔ دنیا میں انرجی کے ذرائع کی بہتات کے باوجود روشنیاں زرد تھیں اور یہ خوب صورت جزیرہ جس میں ایک زمانے میں صرف ڈائناسورس آباد تھے۔ مختلف رنگ اور نقشے اس طرح پیش کر رہا تھا جیسے اس کا اپنا کوئی تشخص نہ ہو۔ جن موٹے موٹے درختوں کو میں نے اپنی ہری شاخوں اور پتّوں کو ہوا میں لہراتے دیکھا تھا۔ اب ان کا کوئی وجود نہ تھا۔ نئے نئے درخت ہر جگہ تھے۔ پھلوں اور پھولوں کے انواع و الوان سے معلوم ہوتا تھا کہ مٹی اور بیج سب کچھ بدل گیا ہے۔ سرد اور ٹراپیکل ماحول میں فرق بہت کم ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے پرانے دوست سے جو بیس سال پہلے سفید کالر لگاتا تھا، ہیٹ پہنتا تھا اور چھتری لے کر چلتا تھا لیکن اب صرف جینز اور جیکٹ پہنے ہوئے تھا، پوچھا۔

"یہ سب لوگ۔ . . . ؟"

"ہاں، یہ سب لوگ۔"

"پھر جین (GENE) اور ماحول؟"

"کچھ نہیں (GENE) جین بے اثر ہو گئی اور ماحول EVOLVE ہو رہا ہے"

"اور تکلّف اور مراتب اور اقدار؟"

"کون سے مراتب اور کون سی اقدار؟ تم نے وہ جگہ دیکھی جہاں تم پچھلی بار مہمان تھے؟"

"نہیں۔ میری وہاں جانے کی ہمّت نہ ہوئی۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ تمہارے ٹی وی نے اُسے غیر محفوظ علاقہ بتایا ہے۔"

"پھر تم اقدار کے بارے میں کیوں سوال کرتے ہو۔ پہرے دار بٹھا کر ان کی حفاظت تو نہیں کی جا سکتی۔ دیکھو میرا لباس"،

"یہ تو فیشن ہے۔"

"ہاں، سب کچھ فیشن ہے۔ رسم و رواج، سوچ کا انداز، کام کا طریقہ۔ اب DECETRALISATION کا زمانہ ہے۔"

میں اپنے دوست سے پوری طرح متفق نہیں تھا۔ لیکن بحث کو طول دینا نہیں چاہتا تھا۔ رات کافی گزر چکی تھی اور سڑکیں بقول شخصے محفوظ نہیں تھیں۔ سیمنٹ کی سڑکیں یوں بھی کم رہ گئی تھیں ستارکول کی کالی سڑکیں رات گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ کالی اور اندھیری ہو گئی تھیں۔ موسم میں اعتدال نہیں تھا۔ کبھی گرمی زیادہ کبھی خشک سالی کی وجہ سے پانی کی راشننگ اور کبھی ہلکی بوندا باندی پاؤں پھسلنے کا ڈر، اور اب اپنے اوپر اتنا اعتماد بھی نہیں تھا سوچا کہ زیادہ دیر ہو جائے گی تو گھر میں مشکل ہوگی۔ کم سے کم اپنے کمرے کے اندر تو احساس تحفظ ہوگا۔

آج میں آرٹ گیلری کے پاس سے گزر رہا تھا۔ سڑک کے دوسری جانب ایک حاملہ عورت اپنے دونوں ہاتھوں میں دو بھاری بیگ لیے جا رہی تھی۔ بیگ یقیناً کافی بھاری رہے ہوں گے۔ کیوں کہ کچھ دور چلنے کے بعد وہ انھیں فٹ پاتھ پر رکھ دیتی تھی اور پھر اٹھا کر چلنے لگتی تھی۔ غیر ارادی طور پر میں نے سڑک کے دوسری جانب دیکھا۔ ایک پولیس مین اور ایک پولیس وومن کھڑے تھے۔ حاملہ عورت ان کے بالکل قریب سے گزری۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ یہ لوگ، یہاں کے رواج اور قاعدے کے مطابق اس عورت کی ضرور مدد کریں گے۔ دونوں نے عورت کو بیگ اٹھاتے ہوئے چلتے دیکھا اور پھر مڑ کر ٹرافلگار اسکوائر میں نیلسن کی اونچی مورت کی طرف دیکھنے لگے جو اندھیرے میں صرف آدھی نظر آ رہی تھی۔

٭

تو نے انسانوں کی قربانی اگر ماضی میں کی
عقل نے اسلاف کی تیرے نہیں کی رہبری
ذبح کثرت سے مویشی کرتا ہے گر آج تو
سوچ بامقصد کہ بے مقصد بہاتا ہے لہو
رسم قربانی بے مقصد سے میں راضی نہیں
دین میرا آپ بیری کی مذہب ماضی نہیں
جذبۂ ایثار وہ ہے جس پہ مجھ کو ناز ہے
کربلا کی سرزمیں میں دفن جس کا راز ہے

# Thou Shalt Not Kill

آج قابیلی طرا انا لیدیٰ ایمیج لاشعور سے نکل کر شعور پر چھا گیا۔

"وہ کیسے؟"

وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش رہا۔ شاید عام بات کہنا اس کے لیے ممکن ہی نہ تھا یا شاید مہمل بات کہہ کر کچھ چھپانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے دوست کو جو اس سے ہم کلام تھے اپنا سوال دہرانے کی ضرورت نہ ہوئی۔

"یہی کہ وہ ایلن وائٹل (ELAN VITAL) جس نے تطوری عمل کو روک کر ہم میں فرق پیدا کر دیا تھا اور ڈارون اور برگساں کی چپقلش کا باعث ہوا وہ مجھے دکھائی دے رہا ہے۔"

اس کا دوست پھر کچھ نہ سمجھ سکا لیکن اس امر کا اعتراف شاید اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ معلوم نہیں کہ عقلی عنصر کی وجہ سے یا بنیادی احساس کمتری کی وجہ سے جس نے اس کو برتری کا شعوری اور منافقانہ ہتھیار استعمال کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے پھر وہی سوال کیا۔

"وہ کیسے؟"

یہ سوال اس کے لیے آسان معلوم ہوتا تھا یا شاید اس کی بنیادی جہالت کے دفاع کے لیے ایک کارآمد خول تھا جسے پہن کر وہ اپنی آنکھ، اپنا چہرہ اور اپنی ہر وہ چیز چھپا سکتا تھا جو اس کی کمزوری کو ظاہر کر سکتی تھی۔

"وہ دیکھو نا سڑک کی طرف، تیز رفتار گاڑیاں رکی ہوئی ہیں اور ان میں بیٹھے عقلی زندگی کے حامل پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ ان کی تیز رفتاری میں کمی آگئی ہے اور ان کے لیے وقت ٹھہر گیا ہے۔ وہ کرتیں جو زمینی رفتار اور میتھ میٹکس کے مطابق صدیوں بعد ان تک پہنچتی ہیں راستہ بدل رہی ہیں اور ترچھی ہوتی جا رہی ہیں، اور گاڑیوں میں بیٹھے لوگ ترچھے ہوتے جا رہے ہیں اور گردن نکال کر بار بار باہر دیکھتے ہیں اور پھر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتے ہیں اور گردن اندر کر لیتے ہیں۔ شاید وہ یہی سوچ رہے ہیں کہ کل کا دن نکل گیا تو کیا ہوگا، کل کا دن، اس تقویم کے مطابق جو کئی بار بنی اور بگڑی اور جس میں کچھ بھی صحیح نہیں۔"

اس کا دوست شاید اس کی پوری بات نہ سمجھ سکا لیکن یہ ضرور سمجھا کہ وہ کسی تقویم کی بات کر رہا ہے جس کا تعلق ٹریفک اور تیز رفتاری سے ہے یا کسی جیم سے ہے۔ لیکن شاید اس نے کوئی ایسا سوال نہ کرنا چاہا جس سے اس کی غیر مکمل تفہیم کی تنقیص ہو۔ اس نے پھر ایکٹنگ کی اور منہ بنا کر ایسا سوال کیا جو اسے مزید وضاحت پر مجبور کر سکے۔

"کیوں؟"

اس لیے کہ ہم اپنے دن تاریخ میں ہر موسم کا لطف لینے کے عادی ہیں۔

اس کے دوست نے کوئی دوسرا سوال نہ کیا۔ شاید یہ اس کے بس کی بات نہ تھی کیوں کہ اس نے اب جو کچھ کہا تھا اس نے اس کی بات کو اور پیچیدہ کر دیا تھا مگر اس کی مشکل آسان ہو گئی کیوں کہ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"مگر تقویم والا معاملہ تو زیلی ہے۔ دن اور موسم کوئی بھی ہو یہ فریضہ تو ادا کرنا ہے اور پھر اس نے اباؤٹ ٹرن کیا اور اپنی پشت علاقۂ ممنوعہ کی طرف کر لی اور دونوں ہاتھ دونوں طرف پھیلائے اور کہنے لگا۔

اِدھر اُدھر، اِدھر اُدھر

میزان سات سو میلین

مفروضہ دس فی صد

اب شاید اس کے دوست کی سمجھ میں اس کی باتیں آنے لگی تھیں اس لیے کہ اس نے فوراً احتجاج کیا۔

"مگر یہ تو ریشنل تھنکنگ ہے۔ یہ عقیدت اور روایت پر کیسے غالب آسکتی ہے"

اس نے ایک ہاتھ کی ہتھیلی میں دوسرے ہاتھ کی مٹھی ماری۔

"کس نے کہا کہ یہ اریشنلیٹی ہے۔ یہ تو فرار ہے روایت سے۔ روائت تو انسانوں کی تھی رشایدان کی افادیت لوگوں کو معلوم ہوگئی تھی۔ وہ جائداد کے طور پر زیادہ کارآمد تھے۔ ۔ ۔ ۔ "

اور وہ خاموش ہوگیا۔ اس کا دوست منتظر تھا کہ وہ جملہ پورا کرے۔ اس دوران بہت سے قیدی دکھائی دیے۔ پک اپ۔ کار۔ ویگن اور پیدل دولہا۔ دلہنوں کی ایک رات کی زندگی تھی۔ تقویم کے مطابق ان کے دن پورے ہو چکے تھے اور بار اور بابل کا تختہ تطوری عمل سے اکٹ کر خلیفۃ اللہ نے کمانڈ ایشو کر دیا تھا۔ لیکن مہاکالی اور کوکن اور ہائیڈرا اس حکم کے تابع نہ تھے، اور شکست خوردہ زیو کی آواز آرہی تھی۔

"کتنے ؟"

اور اس نے آنکھیں مٹکانی شروع کیں۔ پہلے اوپر، پھر نیچے، پھر دائیں، پھر بائیں اور پھر انگلی سے دنیا کا نقشہ بنایا اور بحرالکاہل سے لے کر افقی اور عمودی لائنیں کھینچتا ہوا بحر اوقیانوس تک پہنچا۔ سب نقطے اور لائنیں لال رنگ کی تھیں۔ سرخ گلاب۔ جام جم۔ ہیمو۔ یہی رنگ ہے نا جو دیوتاؤں کو پسند ہے ؟"

دیوتاؤں کی پسند اور ناپسند کے بارے میں شاید اس کے دوست کو کچھ بھی نہ معلوم تھا۔ وہ کیا جواب دیتا۔ ویسے اس کو اپنے ہم کلام کے جواب کی شاید ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیوں کہ اس کی انگلی ٹریفک کی طرف اٹھ کر ٹھہر گئی تھی۔ پھر جس مقام پر وہ بیٹھا تھا اس کے مرکز پر اور پچھم سمت میں اور اتر سمت میں اور جنوبی سمت میں اور پوربی سمت میں اس نے علی التوالی لال سطریں بنائیں اور بولا۔

"اتنا تو بہہ چکا لیکن پیاس نہیں بجھی"

شاید اس کے دوست کی سمجھ میں اس کی بات آ گئی۔ اس نے کہا۔

"وہ خدا کی خوشنودی۔ یہ خلیفۂ خدا کی۔"

"ایک نبی کی سنتان کی سنّت۔ دوسری کافر کی سنتان کی سنّت۔ یہاں مت بھید ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ کہہ کر اس نے ساری لائنیں مٹا دیں اور بولا۔

"پُلَس"

"وہ کیا؟"

اور اس نے قدرے توقف کے بعد پھر اپنی انگلیوں پر اور انگلیوں کے اشارے سے ہوا میں جوڑنا گھٹانا شروع کیا اور پھر اپنے دوست سے مخاطب ہو کر ایسے سوال کیا جیسے جواب صرف اثبات میں چاہتا ہو۔

کیا اتنے میں ساری جھونپڑیاں مکانوں میں اور ساری پگڈنڈیاں سڑکوں میں اور ساری پسلیاں گوشت میں اور لنگوٹیاں دھوتیوں میں تبدیل نہیں ہو سکتیں؟"

اُس کے دوست نے اس کی امید کے خلاف اثبات میں جواب نہ دیا۔

"عقیدے کو عقل کے تابع نہ کرو ورنہ موت زندگی پر غالب آ جائے گی۔"

"تو ویسے بھی کہاں مغلوب ہے۔ میں نے تو وہ حساب کیا ہی نہیں کیونکہ میں تطوری عمل میں پیچھے رہ جانے والوں کو افادی نظریے کے تحت دیکھ رہا تھا۔"

"اور ابن آدم والی سنت؟"

"ان کے اکسپلوژن کی نہیں ایلمینیشن کی افادیت ہے۔ منہ کم باتیں کم۔ عرش ہلانے والے کم۔ کیا خیال ہے؟"

اور یہ کہہ کر اس نے وہ لال رنگ جو ڈبّے میں بھر کر لایا تھا زمین پر انڈیل دیا اور وہ ٹیلے کے دونوں طرف بہنے لگا۔

ٹریفک تیز ہو گیا تھا۔ شاید جیم ختم ہو گیا تھا۔ اس کا دوست کہہ رہا تھا۔

"لوگ آگے جا کر تندرست اور توانا پشت تلاش کریں گے تاکہ منزل تک پہنچنے میں آسانی ہو۔"

میں آسانی ہو؟

اور پھر وہ قافلہ بھی نظر آیا جو تطوری عمل میں پیدل چلنے والوں کا تھا جو ہرا دست کے طور پر سال بھر سے منزل پر بیٹھے تھے۔

میں نے اس کا اور اس کے دوست کا شانہ پکڑ کر زور سے ہلایا۔

"دیکھو!"

میرے دونوں ہاتھ فضا میں لہرا رہے تھے اور لال رنگ زمین پر بکھرا ہوا تھا۔

○
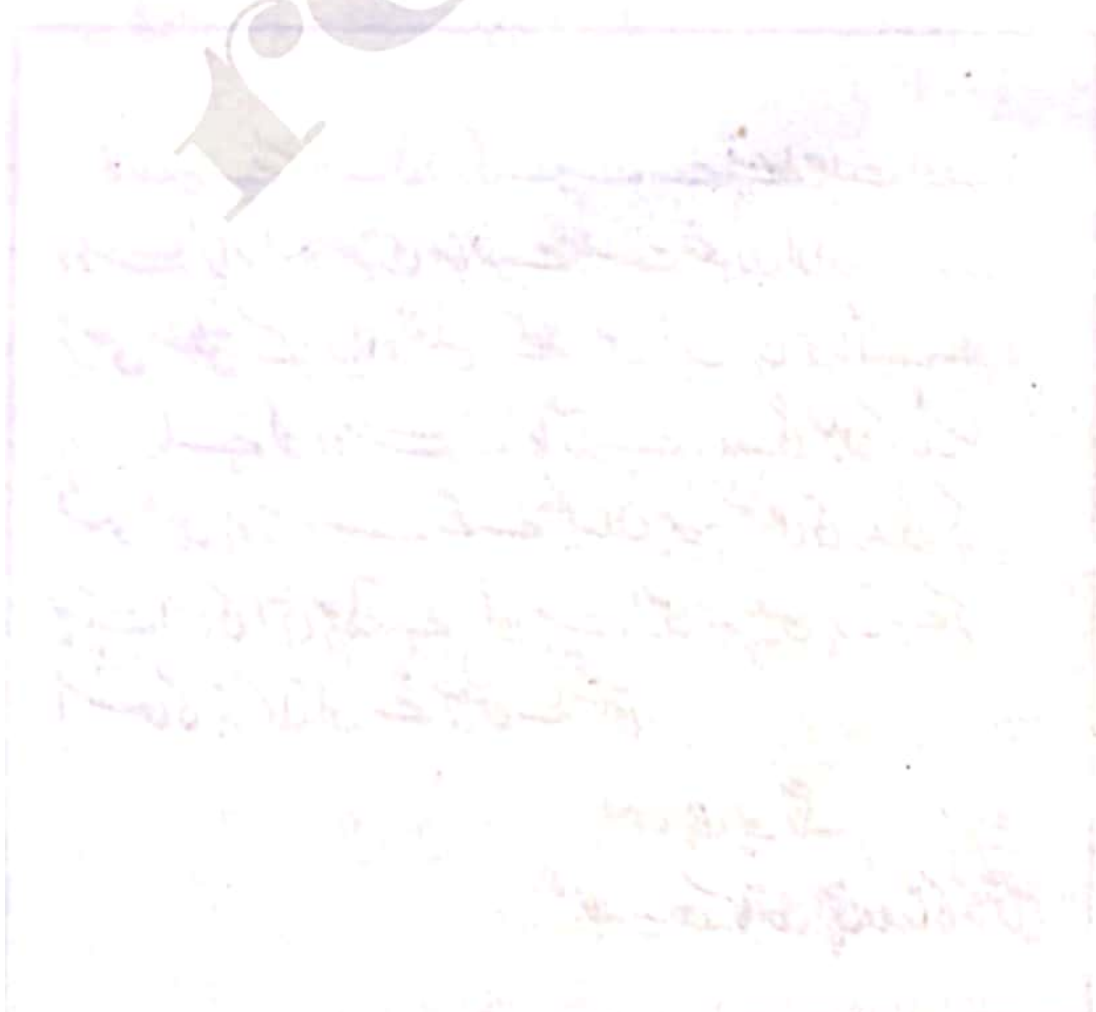
قاعدہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے بہت سے فیصلے جبلت اور دوسرے پُراسرار لاشعوری عناصر سے بہ نسبت شعوری ارادے اور پُرمعنی منطق کے، زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ ایک ہی جوتا ایک کے فٹ ہوتا ہے اور دوسرے کے کاٹتا ہے۔ زندگی میں کوئی ایسا نسخہ نہیں ہوتا جو سب کے لئے یکساں ہو۔ ہر شخص کی زندگی کی ہیئت اس کی اپنی ہوتی ہے۔ اور ہیئت ایسی غیر معین ہوتی ہے کہ اس کی جگہ کوئی اور شے نہیں لے سکتی۔

سی جی یونگ
"جدید دور کا آدمی اپنی روح کی تلاش میں"

# ڈِڈلیٹر

"ہیلو!"

"ہیلو!"

"پھول۔ زرد شعلے۔۔۔۔"

"اچھا۔ وہ فاکلینڈ والی کہانی کی طرح۔ کیا تھی وہ۔ ہاں۔ ٹھنڈی ریگ کے شعلے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ وہی جس پر آریز نے قبضہ کر لیا تھا۔۔۔۔"

"لیکن تمہیں کیسے معلوم۔۔۔۔؟"

"اچھا۔ کھلا ہوا ہے۔۔۔۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ اسٹیمپ پر دن تاریخ پڑھے نہیں جاتے۔ تو بہت ہی پرانا ہوگا، مگر اب پہونچنے سے کیا فائدہ۔۔۔۔؟"

"نہیں۔ خط اپنی افادیت کبھی نہیں کھوتا۔ اس کی افادیت لکھنے والے کے لیے وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔"

"میں مرسل الیہ کی بابت کر رہا ہوں۔ مرسل کی نہیں۔"

"WELL! THAT DEPENDS"

کرڈکرڈکرڈ ڑ۔۔۔ ڑ۔۔۔ ڑ۔۔۔ ڑ۔۔۔ شٹر بند ہوگیا۔

وہ کیا ہے؟ پھاڑ ڈالو۔ نہیں۔ کیوں؟ تم لوگ جب بہت زیادہ منطقی ہو جاتے ہو

ہو تو بالکل غیر منطقی نظر آنے لگتے ہو۔ وہ منطق بھی کیا جس میں مروت نہ ہو۔۔۔۔"

"القاب۔ آداب۔۔۔؟"

"نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ ہاں۔ رنگ ہی رنگ۔۔۔۔۔"

"گلابی۔ زرد۔ آنچلی۔۔۔۔"

"وہ کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔؟"

"بھائی آنچل کا رنگ۔ یونیورسل UNDEFINED"

"اچھا سناؤ۔۔۔۔"

"مگر کیا۔۔۔؟ مفقود الخبر ہے یا مر گیا۔ اب تو یہ وصیت ہے تم ایسے ہی ڈیڈ لیٹر کہتے پھرتے ہو۔"

"اچھا سنو۔ مگر ایک شرط۔ وہ مل جائے تو بتانا نہیں کہ تم نے سنا تھا۔"

"یار دیکھو، ویسے تو وعدہ کرتا ہوں مگر دو سالڈ باتیں کسی کو ہضم نہیں ہوتیں۔ ایک کرائم اور دوسرا اسکینڈل۔ یہ نہ ہوئے تو وعدہ" (قہقہے کی آواز)

"اور تم جانتے ہو۔ مجھے تم اچانک مل گئے تھے، گرینڈ ٹرنک روڈ پر جو اس جگہ دریا کے پیٹ سے نکلے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھروں اور چونے سے بنی ہوئی تھی۔ صدیوں پہلے سے لوگ اسی طرح چل رہے تھے جیسے تم اس دن۔ آشتی۔ من بھاتی۔ تن آسانی۔ سبک روانی۔۔۔۔"

"ٹھہرو۔ یہ کیا ہے۔۔۔۔؟"

"مجھے کیا معلوم۔ شاید چال کی آواز ہو گی۔ چپ چپ۔ چھن چھن۔ ہولے ہولے۔۔۔۔"

"او کے۔ پروسیڈ"

میں بھی وہیں تھا تمہیں چلتے دیکھ رہا تھا۔ تم بہت دور نظر آ رہے تھے۔ میرا راستہ تمہارے راستے کے متوازی تھا۔ جو لاکھی کے لاووں سے بنا ہوا اور پہاڑوں سے گری ہوئی چٹانوں سے پٹا ہوا، کانٹے دار جھاڑیوں سے بھرا ہوا، برف کی ڈھلوان چھوتی ہوئی

سے ہوتا ہوا اور چال کی آواز رائزنگ ڈفتھانگ ....

پتھر ہٹاتے والی آواز پہلے۔ چلنے والی بعد میں۔ کانٹا نکلنے کی آواز پہلے، چیخ کی بعد میں۔ خون نکلنے سے پہلے چبھنے کا احساس اور اگر ذرا پیر پھسلا تو بہت ہی گہری کھائی، جان لیوا .....

ہاں۔ چلنے والے۔ دکھی۔ سطح سے اونچے ہو کر طوفان کا تھپیڑا کھانے والے۔ کچی شراب نہیں پیتے۔ یورنیل استعمال نہیں کرتے۔ دونوں پاؤں برابر نہیں رکھتے۔ ڈنگ آئنگ۔ ریٹارڈ ٹو۔ دیوانے۔ آدم بیزار۔ سڑے ہوئے چہرے۔

کسی موڑ پر تم نے میری طرف دیکھا۔ معلوم نہیں کیا تھا۔ ایڈونچر۔ کمپنسیشن۔ تنہائی۔ لگن۔ میگنٹ۔ لائن آف فلکس۔ شعوری لاشعوری۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بس ایک قدم غیر متوازی اس طرف پڑا۔ تم کہتے ہو میں نے بلایا تھا۔ یاد نہیں۔ شاید بس بھیڑ سے الگ ہو کر خار دار جھاڑیوں میں گھس گئے ..... (خاموشی)

"اور ادھر والے ساتھی .....؟"

"ہاں۔ ذرا دم تو لینے دو......"

وہ آوازیں دے رہے تھے اور تم اپنے تلووں سے چبھے ہوئے کانٹے نکال رہے تھے۔ مجھے ہنسی آگئی۔ بھلا یہ۔ دیکھو نا۔ رفتار تو پہلے ہی سست ہے، مگر جب تمہارے قدم بڑھے تو ایک قدم بھیڑ میں چلنے والوں کے سیکڑوں قدموں کے برابر تھا .....

دھڑ دھڑ دھڑ۔ لینڈ سلائڈ کی آواز۔ بچ کے .....

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تمہارا دوسرا قدم بھی ایسے پڑا کہ ایک چٹان پر اور دوسرا ببول کی جھاڑی پر۔ میں نے جھک کر تمہارے کانٹے نکالے اور تمہارے مسکراتے ہوئے زخموں کو دیکھا۔ پھر میں نے اپنے پیر کے تلووں کو نمایاں کیا۔ اس طرح کہ تم بھی دیکھو۔ میرے زخم بھی ویسے ہی تھے۔ ذرا پرانے اور گہرے .....

تم نے میری جانب اندرونی درد اور بیرونی مسکراہٹ سے دیکھا۔ کچھ عجیب سے لگے تم۔ کئی شکلیں نظر آئیں۔ مونیکا۔ اتھینا۔ سائیکے۔ رادھا۔ کلیوپیٹرا۔ فریگا۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جیب سے منگل سوتر نکالا اور تمہارے گلے میں ڈال دیا۔

"ایس۔ پنڈت اور سوا ہا کا ذکر نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"YOU DUD ۔ منگل سوتر دو اجنبیوں کا میل ہے باقی سماج کا میل۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اور پھر۔ پھر مجھے آرتمس کی جوت دکھائی دی۔

کورل راک دکھائی دی۔

میوزا اور سرسوتی ہنس رہے تھے۔

وہ پھر آوازیں دے رہے تھے۔ اپنی طرف بلا رہے تھے، مگر تم۔ تم رُک رُک کر کانٹے نکال رہے تھے۔ وہ آشتی کی طرف بلا رہے تھے۔ تم کرانتی کی طرف جا رہے تھے۔

میں نے ایک بار پوچھا بھی تھا۔

"کیوں ؟"

"بس یونہی۔ میرا فیصلہ"

"کیا پسند آیا ؟"

"سطح سے بلند ہونا"

"مگر فضاؤں میں کھو سکتے ہو۔ کون جانے کسی فیز میں کوئی خرابی ہو سکتی ہے، اور چیلنجر تباہ ہو سکتا ہے۔"

"اونچائی کی گمنامی نیچائی کی بسیار نامی سے بہتر ہے۔"

"مگر یہ مشکل۔ ناہموار۔ سبت رفتار۔ بھول بھلیاں !"

"یہی دیوتاؤں اور دیویوں کا راستہ ہے"

"یہاں تو کوئی نہیں۔ صرف میں ہوں اور تم۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"تمہیں کیا معلوم مجھے کیا دکھائی دے رہا ہے۔"

"الیوزن۔ ایبسرڈ۔" اور میں تیز تیز چلنے لگا۔

(خاموشی)

"آگے بڑھو۔ چپ کیوں ہوگئے؟"

"بس کوشش کر رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے اس جگہ کچھ پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ روشنائی پھیکی سی پھیلی پھیلی سی ہے۔ لفظ پڑھے نہیں جاتے۔ پانی کے قطرے سوکھ گئے ہیں۔ دھبے باقی ہیں؟"

"اچھا وہ سناؤ جو پڑھا جاتا ہے"

اس لفافے میں ایک لمحے کی باتیں ہیں۔ میری نہیں اور نہ میں نے انھیں قلم بند کیا۔ یہ خود کار تحریر ہے۔ انتروانی کی تصویر۔ خواب سا ساطیر۔ آٹومیشن۔ بالکل میڈیم کے قلم کی طرح۔ پھر دھبے....

یہ لو اور دعائیں جس راستے پر چلو پھول بچھاتے اور کانٹے چبھاتے۔ لوگوں کو خوشبو اور کسک ایک ساتھ محسوس ہو۔ مگر یہ نہ معلوم ہو کہ پھول کدھر کھلتے ہیں اور کانٹے کدھر اگتے ہیں۔ زندگی خوب صورت ہے کہ بدصورت۔ سفید خلیے زیادہ ہوتے ہیں یا سرخ خلیے۔

"بس"

"نہیں۔ گیپ اور آخری صفحہ" "آگ۔ شعلہ۔ کاربن مونا کسائڈ۔ اس نے سارے گھر میں پھیل کر آکسیجن ختم کر دیا۔ لوگ سمجھتے ہیں اس میں خوشبو اور بدبو نہیں۔ لیکن مجھے تو خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔ بالکل روز سہرے کی طرح۔ اور میٹھا میٹھا مزہ اور......

اور پھر کسی پہاڑی کے دامن میں مرغابیوں کی غول میں کھلا ہوا جھیل کا خوبصورت کنول۔ یہ آخری اچھا....

"مر گیا؟"

"مجھے کیا معلوم۔ شاید جیتے جی مر گیا یا مر کر جی گیا۔ ہونٹوں کا تو کوئی ذکر نہیں ہے"

"پھاڑنا نہیں۔ لفافے میں بند کر دو۔ شاید کوئی دعویدار آجائے"

○

استبدادی حکومت کا اصول "خوف" ہے لیکن بزدل، جاہل اور کم ہمت
لوگ بہت سے قوانین کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ سب کچھ دو
تین اصولوں پر منحصر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی ضرورت نہیں کہ نئے نظریات
کا اضافہ کیا جائے۔ جب ہم کسی گھوڑے کو قابو میں کرنا چاہتے ہیں تو ہم
یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس کا مالک تبدیل نہ ہو اور نہ اس کا سدھانا
اور اس کا قدم۔ اس طرح ان کے دماغ پر دو تین تاثرات سے زیادہ
میں بیٹھا رہتا ہے تو وہ اپنی عشرت گاہ چھوڑ نہیں سکتا بغیر ان لوگوں
کو چونکائے ہوئے جو اسے اپنی عشرت گاہ تک محدود رکھتے ہیں۔
وہ نہیں چاہتے کہ پاور کسی اور کے ہاتھ میں چلی جائے۔
ایسے حاکم میں اتنی خامیاں ہوتی ہیں کہ وہ اپنی فطری حماقت
لوگوں پر ظاہر نہیں کرتا۔۔۔ ایسی حکومت میں نہ کوئی درستی ہوتی ہے
اور نہ ترقی۔۔۔

— بیرون دی مانٹسکی

# پاور ہاؤس

پاور ہاؤس کی عمر تو زیادہ تھی مگر اس کی پائیداری پر کسی کو شک نہ تھا امپورٹڈ مال تھا اور ایسی جگہ سے امپورٹ کیا ہوا جہاں کی صنعت اور ساخت کسی زمانے میں ضرب المثل تھیں۔ جب یہ لوگ ورک شاپ سے جانے لگے تو پاور ہاؤس کا آپریٹنگ مینوئل وہیں چھوڑ دیا۔ لیکن اس کا تکنیکی ڈیٹا اور کل پرزے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس معاملے میں لوگوں کی الگ الگ رائے تھی۔ ایکسپرٹ بھی ایک دوسرے سے مختلف باتیں کرتے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ جب تک چلتا ہے چلاؤ۔ پھر اپنا ڈیزائن تیار کرو۔ دوسرا کہتا تھا کہ تھوڑا بہت رد و بدل کر کے اسی کو چلانا چاہیے۔ نئے ڈیزائن میں بہت سی مشکلات ہوتی ہیں۔ پہلے ڈیزائن سوچو، پھر ماڈل بناؤ، پھر پاور اسپیشلسٹ کو دکھاؤ، پھر ٹسٹ کرو، اور کیا گارنٹی ہے کہ ٹسٹ کامیاب رہے گا۔ کچھ اکسپرٹ صرف مسکرا کر رہ جاتے تھے اور کچھ کندھا سکوڑ کر اپنی عدم اعتمادی کا اظہار کرتے تھے۔ بجلی کے صارفین بھی پاور ہاؤس کے بارے میں بحث و مباحثہ کرتے رہتے تھے، لیکن ان کی اکسر سائز زبان، آنکھ اور سانس تک محدود تھی۔

کافی مدت تک بحث و مباحثہ کا یہ فائدہ ہوا کہ پرانے اہلکار مختصر وقفے بعد ہی بدل گئے اور پاور ہاؤس چلتا رہا۔ یہ اور بات ہے کہ وائلیج فلکچویشن بہت ہوتا تھا۔ لیکن جلنے کے لیے لوگوں کے پاس کم سامان تھا۔ ریڈیو زیادہ تر بیٹری سے چلتا تھا یا بند رہتا تھا۔ ویسے بھی ریڈیو اس پر ڈکشن یا پلاسٹک ایج کا نہیں تھا۔ جلدی خراب بھی نہیں ہوتا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن ابھی تک اپنا جنریٹر چلاتا تھا جس میں ایک اسٹبلائزر لگا دیا گیا تھا۔ اس کے چلنے یا

نہ چلنے کا انحصار ابھی تک مین پاور یا کنٹرولڈ گرڈ اسٹیشن پر نہیں تھا۔ ٹی وی ابھی تک رائج نہیں ہوا تھا اور لوگ تصویروں سے زیادہ آوازوں سے آشنا تھے۔ اگر آواز پسند نہ آتی تھی تو ریڈیو بند کر دیتے تھے۔ اسکرین پر ناپسندیدہ تصویر دیکھ کر ناسیا کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ بات زیادہ نہ بڑھتی اور شاید زیادہ نہ گھٹتی اگر بستی کا ایک پرانا زور آزما پاور ہاؤس کی چھت پر بیٹھ کر نہ چیختا۔

" نکل جاؤ تم لوگ۔ ہمارے پاور ہاؤس کو موٹا کروڈ اور کباڑ ڈھلنے کے پرزے ڈال کر چلا رہے ہو۔ تم یہی کرتے رہے تو انجن سیز ہو جائے گا۔ نکلو سب لوگ۔ میں اس میں ردّوبدل کر کے اسے پائیداری دینا چاہتا ہوں "

لوگ ڈرے اور روئے۔ کچھ نے غصہ کیا اور خاموش رہے۔ کچھ نے زبان کو آگے پیچھے کرنا شروع کیا۔ کچھ نے قلم کو جلدی جلدی دوات میں ڈبونا شروع کیا۔ ثانوی مدرسوں کے مدرسین سے لے کر جامعہ کے استادوں تک سب ہی سوچنے لگے کہ تقریباً سو سال کی تھیوری جو ٹکسٹ کی کتابوں اور سلیبس میں درج ہے ایک دم بدل نہ جائے اور سیشن کے بیچ میں نئے مضامیں نہ پڑھانے پڑ جائیں۔ ایک استاد نے کہا۔

" تو اس میں فکر کی کیا بات ہے۔ کچھ لوگ پرانے نصاب کا امتحان دیں گے اور کچھ نئے کا۔"

" مگر پرانے نصاب والے نئے پاور ہاؤس کو کیسے چلائیں گے۔ وہ تو اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

" صرف ردّوبدل ہوگا، اور پرانوں کو امپورٹڈ یا باہر کے فارغ التحصیل نیٹیوز کے ذریعے او جے ٹی کرا دی جائے گی۔"

لیکن یہ بحث زیادہ دیر نہ چل سکی۔ گورکھوں نے گگریاں سنبھال لیں اور رفیقہ نے لیٹن زبان میں بولنا شروع کیا۔ جمالیاتی اصولوں کے مطابق الفاظ کے آہنگ میں معنی اور مطلب کا احساس مٹ گیا۔ بحث کرنے والے خاموشی سے باہر نکل گئے اور گھر جا کر سلیپنگ سوٹ پہن لیے۔

پاور ہاؤس میں کچھ کچھ اور پاور ٹکنیشنوں میں زیادہ تبدیلی ہوئی، اور فلکچویشن کچھ عرصے کے لیے کم ہو گیا۔ پاور ہاؤس فل کیپیسٹی پر چلنے لگا لیکن جنریٹر تو پرانا تھا۔ سستے ڈیزل اور کباڑ خانے کے پرزے پر اب تک دارومدار تھا۔ نئے نئے ٹکنیشین آتے جاتے رہے۔ کچھ پرانے نصاب سند یافتہ، کچھ نئے اور خارجی آئل پیپر کے حامل۔ کچھ ہی دنوں کے بعد فلکچویشن کے آثار پھر نمودار ہوئے۔ بہت سے گورکھوں نے کھیتی شروع کر دی۔ کچھ نے تجارت کو اپنایا۔ بوڑھا پہلوان چیختے چیختے اور گالیاں دیتے دیتے تھک گیا اور ایک دن اس نے بھی فصیلوں سے نشیب میں چھلانگ لگا دی۔ سامنے کے اور پیچھے کے دروازے سے [illegible] دن آمدورفت ہوتی رہی۔ لیکن پاور ہاؤس تمام نئے غباروں اور جھٹکوں کے باوجود ہچکیاں لیتا رہا اور پھر ایک دن ایک پاور اسپیشلسٹ جس کی پتلون کی کریز [illegible] اور پالش سے سرخ ہو گئی تھی۔ پاور ہاؤس کی چھت پر بیٹھ گیا۔ اسے کسی نے مجنوں نہیں کہا اور نہ کسی نے اس کی ٹانگ گھسیٹنے کی کوشش کی کیوں کہ اس کی آنکھیں سنگترے کی طرح چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔ وہ جنم کا شکاری بھی تھا اور اپنی تکنیکی مہارت کے علاوہ اس نے بہت سے السیشین اور لیبراڈور کی بالغ اور نابالغ نسل اپنے گرد جمع کر رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے گاہے گاہے بجلی کی کڑک جیسی آواز کے ساتھ روشنی نکل رہی تھی۔ بجلی کے نظام میں خرابی کے باعث لوگوں کو روشنی کے سہارے کی ضرورت تھی اور وہ اس روشنی کے لئے اپنے دلوں اور دماغوں کا اندھیرا بھی برداشت کرنے کے لیے تیار تھے۔ سب اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے اور صرف حال میں رہنے لگے۔ مستقبل کی بھلا کس کو فکر ہو سکتی تھی۔ اس اسپیشلسٹ نے حال کو روشن رکھنے کا وعدہ کیا۔ پاور ہاؤس کی مشینوں کو بدل دیا۔ اس کی جگہ امپورٹڈ مشینیں نصب کر دیں۔ [illegible] الیکٹرک کا انتظام قائم کیا اور ہر جگہ ٹربائن لگا دیے۔ اس طرح جب بجلی کا اور ترسیل کا سسٹم کھڑا کیا گیا تو بجلی کے نظام میں استحکام پیدا ہو گیا۔ اس نے گرڈ اسٹیشنوں کو بند کر دیا اور ساری مشینوں کو ایک پہاڑی پر نصب کر کے ریموٹ کنٹرول کا سوئچ اپنے بیڈروم میں لگا لیا۔ کچھ دنوں کے بعد [illegible] جنریٹر کا خودکار سوئچ بھی بند ہو گیا۔ جس جگہ پہلے پاور ہاؤس تھا وہاں ایک اونچی عمارت

پر تمام پرانے مینوئل اور آپریٹنگ انسٹرکشن دفن کر دیئے گئے اور پاور ہاؤس کی تاریخ پھر سے شروع ہوئی۔

بجلی کا نظام بہت مستحکم اور پائیدار ہو گیا۔ فلکچویشن ختم ہو گئے۔ بلب زیادہ دنوں تک چلنے لگے۔ روشنی تیز ہو گئی اور اب اندھیری راتوں میں چاند اور ستاروں کی روشنی کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ لوگوں نے اپنے دیئے لالٹین اور گیس کے لیمپ کباڑ خانے میں پھینک دیئے۔ مگر آدمی کا بنایا ہوا نظام تھا۔ مشینیں کتنی ہی مضبوط اور دیرپا کیوں نہ ہوں فطرت کے نظام کی جگہ تو نہیں لے سکتیں۔ دور دراز کے علاقوں میں پھر بجلی کا نظام خراب ہونے لگا اور پھر قریب کے شہروں میں روشنی غائب ہونے لگی۔ بلب فیوز ہونے لگے اور اندھیرے میں بہت سے لوگ اپنے گھروں سے نکل کر باہر بیٹھ گئے۔ انھوں نے چاند کی روشنی کے سہارے گلیوں میں اور سڑکوں پر جا کر شکایتوں کا دفتر تلاش کرنا شروع کیا۔ مگر یہ دفتر وہاں نہیں تھے۔ صرف ایک دفتر اونچی پہاڑی پر تھا جس پر چڑھنا ناممکن تھا۔ اندھیرا بڑھتا گیا اور ایک دن پاور ہاؤس کا نظام ایک جھٹکے کے ساتھ معطل ہو گیا۔ افراتفری کے عالم میں لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ بہت سے لوگ اپنے گھروں کا راستہ بھول گئے اور جائے پناہ کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ کچھ لوگ کباڑ خانے میں پرانی لالٹینیں اور دیئے تلاش کرنے لگے۔ تیل کی دوکانیں بند تھیں یا کسی کو ملتی نہ تھیں۔ اس لیے لالٹین اور دیئے بھی نہ جل سکے۔ آخر چاند بھی چھپ گیا اور تارے ایک ایک کر کے ڈوب گئے۔ ہر شخص اپنے آپ سے جدا ہو گیا۔ لوگ اپنے ہاتھ پیر چلاتے ہوئے اور اپنے پاس والے کو دھکا دیتے ہوئے راستہ تلاش کرنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ کیڈمس نے یونان سے ڈریگن کے دانت لا کر یہاں کے راستوں میں بو دیئے ہیں۔ کیوں کہ ہر جگہ ایک ہی قبیلے کے لوگ ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اندھیرے میں ایک گمبھیر آواز سنائی دی۔

"LIFE OF A MAN IS NASTY, BRUTISH AND SHORT"

لوگ اپنی اپنی جگہ ٹھہر گئے اور اس آواز کو سننے لگے۔ اس آواز کی بازگشت ہر جگہ

گونجنے لگی اور پھر خاموشی ہو گئی۔

ایک نے کہا "یہ کس کی آواز ہے؟"

دوسرے نے کہا "یہ تو ہالبس کی آواز ہے جو سیکڑوں سال پہلے سنائی دی تھی۔ شاید یہ ریڈیائی لہروں میں محفوظ تھی اور آج اسی فریکوینسی پر آ رہی ہے۔"

تیسرے نے کہا "مگر فریکوینسی کس نے سٹ کی؟"

چوتھے نے کہا "فریکوینسی تو موسم اور حالات سٹ کرتے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں کہ کوئی آدمی اُسے سٹ کرے۔"

لوگ اندھیرے میں سوال و جواب کر رہے تھے۔ کوئی ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ اتنے میں دوسری آواز آئی، اس بار سریلی اور میٹھی۔

"میں ہالبس نہیں لاک ہوں مگر کبھی کبھی مجھ پر دورہ پڑتا ہے اور میں میکاولی کا ٹیل کوٹ پہن لیتا ہوں۔ میں پاور ہاؤس میں جاتا ہوں۔ روشنی جلد آئے گی اور پھر کبھی فلکچویشن نہ ہو گا۔"

سب خاموش ہو گئے۔ پھر ایک دبی دبی آواز میں بولا۔

"معلوم نہیں ہالبس ہے کہ لاک کہ میکاولی۔ کہیں روشنی کے بدلے میرے جینے کا حق نہ مانگ لے؟"

دوسرے نے کہا "کچھ لینا ہے تو کچھ دینا بھی پڑے گا۔"

تیسرے نے کہا "یہ تو کہتے سب ہیں، مگر دیتے کم ہیں اور لیتے زیادہ۔"

ایک دم سے روشنی آگئی۔ جنریٹر اور ٹربائن تیزی سے چلنے لگے۔ فنیّوں کے بجائے فنّانوں نے پاور ہاؤس کا نظام سنبھال لیا۔ گرڈ اسٹیشن پھر کام کرنے لگے اور شکایتوں کے دفتر کھل گئے مگر آٹو میٹک سوئچنگ کا نظام واپس نہ آیا۔ رموٹ کنٹرول کی سوئچ اب بھی بلڈ روم میں تھی۔

پاور ہاؤس کی کارکردگی بڑھانے کے لیے وا لٹیج بڑھا دی گئی۔ اس کے نتیجے میں پہلے کے بنے ہوئے ریڈیو، ٹی وی، ایر کنڈیشنر، ہیٹر اور استری سبھی بیکار ہو گئے اور

لوگوں کو نئے واٹچ کے سامان خریدنے پڑے۔ بہت سے پرانے دروازے بند ہو گئے اور بہت سے نئے پھاٹک کھل گئے۔ دوکانوں کے بورڈ اتر گئے گلیوں اور سڑکوں کے رنگ بدل گئے۔ تمام نئے بورڈ روشنی میں دور سے نظر آجانے والے فلوریسینٹ رنگ میں لکھ دئے گئے اور جب لوگوں کو دوکان اور سامان دونوں خریدنے میں دقت ہونے لگی تو انھوں نے پاور ہاؤس کے اس ٹیپ ریکارڈ کی ہوئی آواز کا سہارا لیا جو صبح دوپہر شام پابندی سے آتی رہتی تھی۔

"مشینیں بہت دنوں سے زنگ آلود ہیں۔ ان میں تیل نہیں ڈالا گیا۔ سب کچھ پرانے ماہرین کی وجہ سے ہوا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اہلکاروں کے بائیونک (BIONIC) ہاتھ لگا دئے جائیں گے۔"

ہر مسئلے کا جواب ٹیپ ریکارڈر کی یہ آواز تھی، اور اس آواز پر آواز بلند کرنا بہت مشکل تھا۔ کیوں کہ پاور ہاؤس کے چاروں طرف بہت سے نئی نسل کے ایسشین بھونکتے رہتے تھے۔ ان کی کھالیں اوروں سے مختلف تھیں اور چہرے پر ماسک چڑھا تھا۔ لوگ ان سے ڈرنے لگے تھے اور اگر کھانا کھاتے وقت یا بازار سے کھانے کا سامان لاتے وقت یہ بھونکنے والے نظر آجاتے تھے تو لوگ جلدی جلدی اپنا بیگ اور پلیٹیں ان کے سامنے خالی کر دیتے تھے اور خالی پیٹ ویلیم کھا کر سو جاتے تھے۔

شہر کی بڑی سڑک کے پار بنجر اور شور زدہ زمین کے ساتھ ساتھ ریٹائرڈ نجومیوں اور موسمی پیامبروں کے گھر تھے۔ ایک دن وہ سب باہر نکل کر آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کے پاس سے گذرنے والے لوگ ٹھہر گئے۔ ایک نے پوچھا۔

"کیا نظر آتا ہے؟"

"اندھیرا۔"

"مگر پاور ہاؤس تو بڑا پائیدار ہے اور روشنی ہر جگہ ہے۔"

"فطرت اور موسم کو پاور ہاؤس کی کارکردگی نہیں بدل سکتی۔"

"مگر موسم خوشگوار ہے اور لوگوں میں حوصلہ ہے۔"

"تمہیں کیا معلوم، ہمیں قوسِ قزح کے رنگ بکھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چاند کی کشش میں اضافہ ہو گیا ہے۔ سمندر میں جوار بھاٹے کا زور بڑھ گیا ہے۔ زمین کے اندر گرمی بڑھ گئی ہے۔ زلزلہ آنے والا ہے"۔

نجومیوں اور موسم کا حال بتلانے والوں کی پیشین گوئیاں صحیح ثابت ہوئیں۔

فطرت اور موسم نہیں بدلے۔ زلزلہ آ گیا۔

پاور ہاؤس کا بڑا حصّہ زمین میں دھنس گیا۔

بہت سی مشینیں بیکار ہو گئیں اور اندھیرا بڑھنے لگا۔

فنیّوں اور فنکاروں نے اسٹیج چھوڑ دیا۔

رات ہوئی تو چاند اور تاروں کی روشنی میں کوئی پھر پاور ہاؤس کی چھت پر بیٹھا نظر آیا۔ لوگ پاور ہاؤس کے نیچے جمع ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

"شاید کوئی نیا کاریگر ہے۔ معلوم نہیں یہ کیا کرے گا"

"مگر یہ تو پروفیشنل کا کام ہے جس کے ہاتھوں میں ٹول بکس ہوتا ہے اس کے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں چاندی کا مٹھ"،

"تو پوچھ لو نا کہ کون ہے؟"

"تم پوچھو"۔

اور پھر یہی دو الفاظ ہر شخص کی زبان زد ہو گئے اور اس سے پہلے کہ وہ آخری آدمی تک پہنچ کر باز گشت کرتے۔ وہ کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں بولا۔

"میں ہادی نہیں محترف ہوں۔ میں تو صرف اس لئے بیٹھا ہوں کہ پاور ہاؤس کی مشینیں کوئی اٹھا کر نہ لے جائے۔ ہادی جلد آئیں گے اور مشینیں کام کرنے لگیں گی"۔

عرصہ گذر گیا۔ ہادی نہ ملے اور اگر ملے تو پتا تو ان کے پاس اوزار نہیں تھے یا ان سے اجرت طے نہ کی جا سکی۔ کثرت کے بعد یک بیک "نوہاؤ" کی قلّت لوگوں کی سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن کوئی کیا کرتا۔ اندھیرے میں سوا روشنی کی امید رکھنے کے اور کیا کیا جا سکتا تھا اور جو امید نہ رکھ سکے وہ مر گئے۔ بہت دن گذر گئے اور پاور ہاؤس کو ٹھیک کرنے

کی کوشش میں محترت خود بادی بن گیا بلکہ اس کے ساتھ اور بھی محترف خبیر کے درجے پر فائز ہوئے اور روشنی آگئی۔ امپورٹڈ تیل، امپورٹڈ پرزے، امپورٹڈ کھانے، امپورٹڈ پینے اور امپورٹڈ جنریشن کی بہتات ہوگئی اور کنزمپشن بڑھ گیا۔ ٹربائن کام کرتے رہے۔ جنریٹر چلتے رہے مگر دریاؤں اور نہروں اور چشموں کے چڑھاؤ اور اتار میں فرق آگیا اور سب پرامن ہوگئے۔ انرجی کم ہوگئی اور لوڈ شیڈنگ ضروری ہوئی۔ مگر روشنی اور اندھیرے اب بھی غیر یقینی تھے۔ آٹومیٹک سوئچنگ ناممکن تھی۔ ریموٹ کنٹرول سوئچ اب بھی ہر روم میں تھی۔

اب روشنی ہوتی تھی تو فلکچویشن ہوتا تھا۔ وولٹیج کافی گھٹ گئی تھی۔ گرمی میں ایرکنڈیشنر نہیں چلتے تھے اور سردی میں ہیٹر بند ہوجاتے تھے۔ گرمی میں لوگ چھتوں پر نمکین پانی میں نہائی ہوئی ہوا میں سونے لگے اور سردی میں روئی زیادہ استعمال کرنے لگے۔ لوگوں کے انڈوکٹرینیشن کے لئے طرح طرح کے نعرے لکھے ہوئے نظر آنے لگے۔ مثلاً کاروں پر لکھا رہتا تھا۔

"تیل بچاؤ اور روشنی زیادہ حاصل کرو۔ صحت بناؤ اور سائیکل پر چڑھو۔"

ایرکنڈیشنر کے بکس جہاز سے اترتے تھے تو گودی سے باہر جانے سے پہلے ان پر تحریر ہوتا تھا۔ "کفرانِ نعمت نہ کرو، قدرتی ہوا کھاؤ، مصنوعی نہیں۔ انرجی بچاؤ۔"

ریفریجریٹر کے بکسوں پر بڑے بڑے الفاظ میں لکھا ہوتا تھا۔

"قومی صنعت کا تحفظ اور انرجی کے بچاؤ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ صراحی کا پانی پیو۔"

اور پیدل چلنے والے سیکڑوں لوگ اپنے اپنے ہاتھوں میں تختیاں لئے چلتے تھے جس پر لکھا ہوتا تھا۔

"انرجی بچاؤ اور عبادت زیادہ کرو"

لیکن اب تمام نعروں کے باوجود کچھ بچانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے کہ انرجی ختم ہوگئی تھی، اور نہ صرف کرنے کے لیے اور نہ بچانے کے لیے کچھ بچا تھا۔ گرڈ اسٹیشن پر بیٹھے بیٹھے

لوڈ شیڈنگ کے نئے عامل شیڈول کے مطابق کام کرتے تھے۔ وہ صرف جنریٹر بند کرکے اندھیرا کرسکتے تھے۔ شیڈول میں ردّوبدل ان کے بس میں نہیں تھا اور شیڈول کمپیوٹرائزڈ سی (COMPUTERIZED-C-3) مرکز میں تیار ہوتا تھا۔

یہ کہانی ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ شیڈول کے مطابق اندھیرا ہوگیا۔ مصنّف نے لکھنا جاری رکھا مگر اسے ایسا لگا جیسے الفاظ ایک دوسرے سے مل کر بے معنی شکلیں بنا رہے ہیں۔ وہ ایسی شکلوں سے مانوس تھا جنھیں وہ خود سمجھ سکتا تھا۔ لیکن وہ اپنے چاروں طرف سے آتے والی ڈراؤنی آوازوں سے مانوس نہ تھا۔ یہ آوازیں طرح طرح کا تاثر دے رہی تھیں۔

پہاڑوں سے چٹانوں کے گرنے کا تاثر۔
آتش فشاں کے پھٹنے کا تاثر۔
آتشیں بگولے کا زمین سے اٹھ کر فضا میں پھیلنے کا تاثر۔
ایک ساتھ بہت سے کتّوں کے بھونکنے کا تاثر۔
ربع الخالی کے جن کی بیٹی نوزہ کی بارات میں آتش بازی کا تاثر۔

مصنّف نے جلدی جلدی اپنے کاغذ سمیٹے اور قلم کو جیب میں بغیر ڈھکنے کے رکھ دیا اور قلم کی نب اس کے سینے کے بائیں طرف چبھتی رہی۔ وہ باہر نکل گیا۔ اسے اندھیرے میں بہت سے سائے نظر آئے۔ وہ اپنے ہاتھوں کو ادھر ادھر پھیلائے راستہ ڈھونڈ رہے تھے۔ نہ کوئی کسی کو پہچانتا تھا اور نہ کسی کی آواز سن سکتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسٹریچر ٹرالی پر لیٹے ہوئے کوما کی حالت میں لوگ مورگ کی طرف لے جائے جا رہے تھے۔ انتظار میں ان وارثوں کے جو پہلے ہی خودکشی کر چکے ہیں۔

ٹرالی چلانے والے پہیّوں کی گڑگڑاہٹ اور ڈراؤنی آواز کی بازگشت کے ساتھ ساتھ مسموع اور غیر مسموع آوازیں نکال رہے تھے۔ ان میں مصنّف بھی شامل ہوگیا اور ہانپتے ہوئے ان الفاظ کو دہرانے لگا جس کا مطلب وہ خود نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن اتنا جانتا تھا کہ وہ اپنے آخری سہارے کی جانب رجوع کی کوشش کر رہا ہے۔

لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین

یہاں کہانی ختم ہوچکی تھی کیوں کہ مصنّف اپنے قلم اور کاغذ سمیٹ کر جا چکا تھا۔ لیکن شاید آیہ کریمہ کا اثر تھا یا آیہ کریمہ کی بدولت تقدیر بدلنے کا حوصلہ تھا کہ ایک بار روشنی پھر آگئی اور سارے گرڈ اسٹیشن کام کرنے لگے اور سوئچنگ کے نظام کی مرکزیت ختم ہوگئی۔

سائنس اور آس کا نظام نارمل ہوگیا لیکن دیمک اور بیکٹیریا کا حملہ اب بھی ہوتا رہا اور روشنی اکثر و بیشتر دھندلی ہوتی رہی ہے۔ ایک ایسے دھندلے ماحول میں کہانی کار نے گھبرا کر پوچھا۔ کیا دیمک اور بیکٹیریا ختم نہیں ہوسکتے اور ایسا لگا کہ ہزاروں سال کے روایتی الفاظ کی لہروں کی شکل میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کا کمپیوٹرائزڈ ورشن ایک ہی ہے۔

ماحول برسوں کی ڈمپنگ سے آلودہ ہوچکا ہے، آلودگی زیادہ ہے اور وقت کم ہے۔ دیمک بیکٹیریا کا سپلیمینٹ ضروری ہے۔ لیکن ان سے زندہ رہنے کا اور بالیدگی کا حق کیسے چھینا جاسکتا ہے۔

مصنّف نے ایک گہری سانس لی اور موٹے موٹے حروف میں "یا آس" لکھا مگر "آ"، لکھتے وقت بیکٹیریا سوئچ میں داخل ہوچکا تھا اور وولٹیج بہت کم تھی۔

○

# ڈوسائے

جیل کی عمارت پری فیبریکیٹڈ تھی اور اگر ڈیزائن کر کے بنوائی بھی جاتی تو زیادہ فرق نہ ہوتا۔ ہر سیل میں کھڑکی تھی۔ پہلے تو سنا ہے یہ نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے کہ قیدیوں کو کھڑکی سے باہر جھانکنے کی یا تو فرصت نہیں تھی یا پھر حزب اللہ نے جو یونانی فلسطین کی نسل سے تھے جھانک تانک کو ٹیبو بنا دیا تھا۔ لیکن جب سے صلاء اللہ کا دور آیا اور لوگوں کو سزا کا اصلاحی یا استحصالی پہلو بتایا گیا۔ اس وقت سے چھ فٹ کی اونچائی پر کھڑکی فیبریکیٹ کی جاتے لگی۔ ایسی ہی کھڑکی سے دونوں نے ایک دوسرے کو پنجوں کے بل پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ ایک نے پوچھا۔

"کب سے ؟"

"یاد نہیں۔ بے ہوشی تھی۔ تم کب سے ؟

"مجھے بھی یاد نہیں۔ سامنمبولزم کا مریض تھا۔ بس ایک دن سوتے میں چلتے چلتے ایک کھلے دروازے میں گھس گیا۔"

"اچھا کیوں ؟"

"پہلے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا۔ بعد میں لوگوں نے بتایا کہ بڑی کاسٹنگ والی بیماری ہو گئی تھی۔ کسی نے کہا پرانے درخت سوکھنے لگے تھے اور نیا سائبان چاہیئے تھا۔ کسی نے کہا ٹریفک ڈائرکٹ کرنا بہت مشکل ہے۔ ایکسیڈنٹ کا ڈر ہر

وقت رہتا ہے۔ کسی نے کہا درخت میں پھل بہت لگتے ہیں۔
منزہ اور ربیٹ دونوں بھار رہے گا۔ کسی کو کیا معلوم کہ مجھے
دھنش اور تتلی اور کنولیس اور کاغذ مرغوب ہیں اور رنگ
پینے کی عادت ہے۔ لیکن سب اپنی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے
تھے۔ سچے تھے۔ مگر میری آنکھیں ان کے پاس نہیں تھیں۔۔۔

تیز روشنی ایک دم سے اندر آئی اور دیوار سے گذرتی ہوئی باہر نکل گئی۔
بالکل خاموشی ہوگئی۔ وہ شاید بے ہوش ہوگئی یا وقت آگے پیچھے ہوگیا تھا۔ مگر یہ تو
معمولی روشنی معلوم ہوتی تھی۔ معلوم نہیں اس نے کیا دیکھا۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔
اس چال میں ردھم تھا۔ بالکل نپا تلا۔ پہرے دار آ رہے تھے۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر کھڑا
ہوگیا اور پنجے برابر کرلئے۔ ایک پہرے دار نے ٹارچ کی روشنی سل کے اندر ڈالی اور
جائزہ لینے لگا۔

"کیا نیند آرہی ہے؟" پہریدار نے اُس کے چہرے کی طرف ٹارچ کی روشنی ڈالتے
ہوئے کہا۔

"آئی تو تھی مگر خواب دیکھنے لگا اور آنکھ کھل گئی"

"تم ابھی تک خواب دیکھتے ہو؟" ایک پہریدار نے دوسرے کو آنکھ مارتے
ہوئے کہا۔

"ہاں کچھ دن سے زیادہ دیکھنے لگا ہوں"

دونوں پہریدار ایک ساتھ زور سے ہنسے۔ ایک نے پھر کہا۔

"اتنے دن اکیلے رہنے کے بعد تو خوابوں کو ختم ہوجانا چاہیئے"

"خواب اکیلے میں نہیں دُکیلے میں ختم ہوتے ہیں۔ اکیلے میں تو وہ سب کچھ
دکھائی دینے لگتا ہے جو وراثت میں ملا ہے"

"کیا ملا ہے وراثت میں۔ ہم تو سمجھتے تھے تمہارے پاس کچھ نہیں ہے"

"ہے تو مگر تمہیں نظر نہیں آتا"

"مثلاً ؟"

" مثلاً سیب۔ سانپ۔ گیہوں۔ سمندر۔ ہری گھاس۔ سوکھی گھاس۔ کانٹے، جنگل۔ چولی اور گیٹر۔"

" پاگل ہوگیا ہے شاید" ایک پہرے دار نے دوسرے سے کہا۔

" کوئی گل نہیں۔ تھوڑا مخول کرن دے۔"

" تو بھئی۔ یہ سب ہوگا تو دکھائی دے گا۔ کہاں ہے ؟" پہرے دار اس سے پھر مخاطب ہوا۔

" جو تمہارے لئے نہیں ہے وہ میرے لئے ہے۔ مجھے دکھائی دیتا ہے۔"

دونوں پہرے دار زور سے ہنسے۔ ایک بولا۔

" ہور کچھ دسنا۔ میں توں تو ویلے ہی دسیا سی جے اے قیدی دا متھا خراب اے"

" چنگا۔ چلئے"

دونوں نے ٹارچ کی روشنی پھر دونوں کوٹھریوں میں ڈالی۔ اس مرتبہ روشنی ریورس ہوگئی۔ پہلے دوسری کھڑکی سے گذری۔ پھر پہلی کھڑکی سے۔ پھر کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کی ایقاعی آواز آئی۔ اندھیرا ہوگیا۔

وہ پھر پنجوں کے بل کھڑا ہوگیا اور کھڑکی میں سے آواز دی۔

" پھر کیا ہوا ؟"

کوئی جواب نہیں۔

" نیند آگئی"

دوسری کھڑکی سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ پھر ایسا لگا کہ کوئی انگڑائی لے رہا ہے۔ وہ پنجوں کے بل کھڑی ہوئی۔

" کیا تم دیر سے کھڑے ہو؟ ایسا لگا کہ میں بیہوش ہوگئی تھی۔ روشنی کے پڑتے ہی۔ معلوم نہیں یہ تیز روشنی کہاں سے آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ وقت اور زمانے کو بدل دیتی ہے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوتا ؟"

"نہیں مجھے تو صرف پہرے دار کی ٹارچ کی روشنی نظر آتی ہے۔ وہ بھی اتنی تیز نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کی بیٹری بھی کمزور ہو گئی ہے۔"

"تو یہ روشنی مجھے کیوں اتنی تیز لگتی ہے۔ میری آنکھیں۔ میرا ہوش سب کچھ جاتا رہتا ہے۔"

"معلوم نہیں۔ شاید پرانا اسوسیئیشن ہو، روشنی سے ڈرنے کا۔"

"شاید ایسا ہی ہو، اور اب ایسا لگا کہ کسی نے مجھے بہت گہری نیند سے جگا دیا۔ جانتے ہو کیسا لگا......"

اور اس کی ہنسی بڑی مترنم تھی۔ وہ کئی بار رک رک کر اسی طرح ہنسی اور پھر ہنستے ہوئے کہا۔

"تم کہو گے یہ بھی کیسی بات کرتی ہے۔ تم نے وہ کہانی پڑھی ہے بچوں کی سوتی بیٹی والی، اور اسے ایک پیار کے بوسے نے زندہ کیا تھا۔"

"تم اسے بچوں کی کہانی کہتی ہو۔ یہ تو ایک کائناتی سمبل ہے۔ زمان و مکاں۔ وقت و تقویم سے زیادہ بلند۔ لیکن یہ سب کیوں کہہ رہی ہو؟"

"تمہیں بتانے کے لیے، کہ شاید تم نے مجھے جگا دیا یا جلا دیا۔"

"اچھا اب آگے سناؤ۔ تم نے کاغذ کھانے اور رنگ پینے کی بات کی تھی نا؟"

"ہاں تو پھر عرصے تک مجھے یہ سب کچھ نہ ملا۔ میں کیا کرتی، بس جھولے میں ڈال دی جاتی تھی اور جھولتی رہتی تھی۔ جھولا جھلانے والا مجھے میٹھے میٹھے پھل کھلاتا اور شربت پلاتا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ میں پھر بھی بھوکی پیاسی رہتی ہوں۔ کبھی میرا باپ برش سے رنگ گھولتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ کبھی میرا بھائی کاغذ کے ٹکڑے سمیٹتا ہوا نظر آتا تھا اور جب میں دوڑ کر اپنی محبوب غذا کے قریب جانا چاہتی تھی تو جھولے کی پینگیں تیز ہو جاتی تھیں۔ میں دیر تک معلق رہتی تھی۔ جھولے سے نیچے آئی تو کھاد کے ڈھیر میں گر گئی۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنے اور کھاد صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھی تو میرے گرد کھڑے ہوئے لوگ قہقہے لگا رہے تھے اور ایک کرخت آواز مجھے ڈرا رہی تھی۔

"فرٹیلائزر کو صاف نہ کرو نہیں تو نمو مشکل ہوگی۔" میرے پاس تازے پھول کا گلدستہ بھی تھا لیکن میں اس میں لگے ہوئے پھولوں کا رنگ نہیں اتار سکتی تھی۔ جس باغ میں میرا جھولا تھا اس میں ایک جھیل تھی، اور اس کے چاروں طرف ہرسنگھار کے پھول پڑے تھے۔ میں نے اُس کے ڈنٹھل جھیل کے پانی میں ڈال دیئے۔ پانی رنگین ہوگیا۔ میں نے وہ پانی پی لیا اور کاغذ جیسے صاف شفاف پھول کھائے۔ مجھے سیری ہوئی میری پیاس بجھ گئی اور اب میں اسی جھیل کا پانی پیتی تھی اور ہرسنگھار کے پھول کھاتی تھی۔ لیکن لوگ مجھے اکیلا نہ چھوڑتے تھے۔ جب میں رنگ دار پانی کی طرف جاتی تھی تو کوئی نہ کوئی میرے ساتھ ہوتا تھا اور میں جھیل کے کنارے کنارے چلتی تھی۔ اُس میں تیر نہیں سکتی تھی۔.....

"اچھا۔ اب یہ بتاؤ۔ تم کیوں ؟"

"مگر تم نے بات تو پوری کی ہی نہیں"

"اگر بات پوری ہوگئی تو ہمارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہ جائے گا۔ پھر شاید تمہیں نیند آجائے یا شاید ہم دونوں کو۔ جب تک ہم اپنی سل میں ہیں اور صرف ہماری کھڑکیاں کھلی ہیں اور ہم پنجوں کے بل کھڑے ہوسکتے ہیں۔ بات پوری نہ کرنا۔ اچھا بتاؤ۔ کیوں ؟"

"اچھا تو سنو۔ میری کہانی تم سے مختلف ہے۔ غار سے امپائر سٹیٹ بلڈنگ تک کہانی مختلف رہی اور شاید آئندہ بھی رہے۔ ہمارے استھانوں کے بدلنے سے پہلے بھی یہی تھا۔ صرف تمہاری کہانی تھی۔ ہماری کہانی بھی تھی مگر اُسے صرف جنگل کے جانور اور راہ کے رہزن سنتے تھے۔"

"لیکن جب تک دیا جلتا رہتا تھا۔ اس وقت تک تو کہانی ایک ہوتی تھی۔"

"وہ تو اُدھار لمحہ ہوتا تھا اس میں کہانی کہاں بنتی تھی۔ سارا وقت کھانے پینے میں گذر جاتا تھا، اور جب دیا بجھتا تھا تو میں نہ ہوتا تھا۔ نہ دروازہ تھا نہ کھڑکی۔ نہ سل اور نہ سائبان۔ یہ تو جب ہرا کرتی اور رمانو نے استھان بدلے تو دروازے بنے۔

دیواریں بنیں اور دیواروں کے پیچھے ہماری تمہاری کہانی جنم لینے لگی"۔

"اچھا پھر کیا ہوا؟"

"میں ہوش میں تھا، مگر بے ہوش ہونے کی دعا کرتا تھا۔ ریگ زاروں اور جنگلوں میں گھومتا تھا۔ کبھی کبھی گارنج سے کھانا اور گٹر کا پانی پیتا تھا"۔

"کیا خون اور روح دھڑکن سے الگ نہیں ہوئے تھے؟"

"ہوئے تھے مگر میرے پیر میرے نہیں تھے۔ میرا ہاتھ اپنا نہیں تھا اور میرا منہ دوسروں کا تھا۔ جانتی ہو اپنا کیا تھا۔ بس یہ آوازیں۔ ایسے۔ ویسے۔ کیوں۔ کیسے۔ ادھر۔ اُدھر۔ کدھر۔ نہیں نہیں۔ میرا پانی کڑوا ہو جاتا تھا اور میرا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ کھٹی ڈکاریں اور ناسیا مجھے اپنے لایعنی وجود کا ہوش دلاتے تھے۔ میں بے ہوش ہو جانا چاہتا تھا، اور ایک دن ایسا ہوا کہ میں بے ہوش تو نہ ہوا مگر مجھے ایمنیشیا اور سامنم بولزم دونوں مرض لاحق ہو گئے۔ لیکن یہ بیماریاں مجھے بہت اچھی لگیں۔ اب مجھے بدہضمی اور قے کا پتہ نہ چلتا تھا، اور ایک دن سوتے میں چلتے چلتے، ویسے مجھے نہیں معلوم۔ یہ کسی اور نے بتایا۔ شاید وہ غلط کہہ رہے ہوں۔ شاید انھوں نے خود مجھے سامنم بولزم کی حالت میں پھینک دیا ہو لیکن میں جانوروں کو پکڑنے والے ایک ٹریپ میں پھنس گیا۔ میرے بستے کا کاغذ ادھر ادھر اڑ گیا اور میری جیبوں میں رکھی ہوئی کئی رنگ کی روشنائی بہنے لگی۔ میں نے گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھا۔ میرے گرد بہت سے لوگ تھے۔ سب نے مل کر ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔ ایک بولا "پکڑ لو اسے"۔ میں نے احتجاج کیا "یہ ٹریپ تو جانوروں کے لئے ہے۔ بجائے ٹریپ ہٹانے کے مجھے پکڑ رہے ہو"۔

"تم تو خود ٹریپ میں آ گئے"

"مگر مجھے تو ہوش ہی نہیں تھا"

"اب ہو جائے گا۔ ہم تمہیں ٹرین کریں گے"

"اچھا میرا بستہ اور روشنائیاں تو دے دو"

"ان کی ضرورت نہیں۔ اس ٹریننگ میں آواز اور ہاتھ اور ٹانگیں اور ہونٹ اور ..... (کچھ حصہ جیل میں سنسر ہو گیا) ..... اور بدن سے کام لیا جاتا ہے۔ مینول لیبر۔ کانشس۔ کانشنشس۔ بے ہوشی کی عیاشی نہیں چلے گی۔"

اس کے بعد وہ چپ ہو گیا۔ کھڑکی کے سامنے سے اس کا سر غائب ہو گیا۔ معلوم نہیں کہ وہ ہے یا نہیں۔ کیوں کہ صرف اس کا سر کھڑکی سے دکھائی دے رہا تھا۔ شاید وہ پنجوں پر کھڑے کھڑے تھک گیا ہو۔ اس نے سوچا اور کئی بار آواز دی۔

"تم مم مم مم مم مم ..... کہاں گئے۔ کیا پنجوں کے بل کھڑے کھڑے تھک گئے۔ دیکھو میں تو اب تک کھڑی ہوں۔ مجھے تمہاری کہانی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ صرف ایک قدر مشترک کی وجہ سے۔ وہی رنگ اور کاغذ۔ بولو۔ تمہارا سر دکھائی نہیں دے رہا ہے۔"

اور وہ پھر کھڑکی پر نظر آیا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہی تو میری کہانی ہے۔ میرا سر دکھائی نہ دیتا تھا۔ مجھے محسوس بھی نہ ہوتا تھا کہ میرا سر بھی ہے۔ صرف دھڑ تھا۔

وہ پھر خاموش ہو گیا، اور کچھ دیر کے بعد بولا۔

"اچھا اب تم بتاؤ۔ تم نے جہاں سے بات ختم کی تھی وہاں سے شروع کرو۔ ہم اگر اور کچھ نہیں کر سکتے تو ایک دوسرے کو اپنی کہانی تو سنا دیں۔ معلوم نہیں پہرے دار کب آ جائیں۔ میں کس سل میں بھیج دیا جاؤں، اور تم کس میں۔ اب تو نہ سل کی دیواریں اٹھانے میں دیر لگتی ہے اور نہ چھت ڈالنے میں۔ "READY FOR QUICK ERECTION YOU KNOW"

"اچھّا تو سنو"

اور پھر ایسا لگا کہ اس نے اپنے پنجوں سے زمین کریدنی شروع کی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"بولتیں کیوں نہیں۔ کیا کر رہی ہو؟"

"یادیں کھود رہی ہوں تاکہ تمہیں باقی کہانی سنا سکوں۔ سنو۔ میرے گھر میں ایک بھڑ کا چھتہ تھا۔ نہ میں اسے چھیڑتی تھی اور نہ کسی کو چھیڑنے دیتی تھی۔ اس لئے کہ میں نے ایک دن ایک بھڑ کو نیا جنم لیتے دیکھا تھا، اور جب اس کا نیا جنم ہوا جسے دوسرے لفظوں میں لوگ یوں کہیں گے کہ جب اس کا بچّہ پیدا ہوا تو وہ ڈھانچہ بن گئی اوپر سے اس کا خول الگ ہوا اور آن کی آن میں بکھر گئی۔ نئے جنم والی اڑ کر کھڑکی سے باہر چلی گئی۔ میں سوچنے لگی۔ عام طور سے ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ ان کے دوسرے جنم کی باتیں یقین، بے یقینی اور شک کے درمیان لُڑھک رہی ہیں اور اشنان، کفن دفن ہو رہا ہے۔ ڈسپوزل کے مختلف طریقے۔ اور پھر جب بیماری میں میرے جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر گرے تو میرے جنم میں کوئی ظاہرا فرق تو نہ آیا۔ لیکن مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں میں نہیں ہوں۔ اب ایک میں تھی اور ایک وہ تھی۔ میں جو جھیل میں ہرسنگھار کے پھول ڈال کر پانی کو رنگین بناتی تھی اور پیاس بجھاتی تھی اور وہ میری ڈبل۔ سا کریال۔ پروگرامڈ روبٹ۔ تم جسے دیکھ رہے ہو۔ وہ میں ہوں۔ رنگین پانی پینے والی۔ دیکھو میرے ہاتھ، میرا چہرہ۔ ان میں رنگ بھرے ہیں نا۔

اور راز کی بات سنو۔ اب میں ہرسنگھار کے علاوہ بہت سے دوسرے پھول پانی میں ڈال دیتی ہوں اور مختلف رنگوں کی آمیزش کرتی ہوں۔ پھر رنگین پانی کو ہلاتی ہوں اور ان کا رُخ بہاؤ کی طرف موڑ دیتی ہوں۔ تیز بہت تیز، اور اسی لئے یہاں ہوں، اکیلی ایک سیل میں۔ وہ سمجھتے ہیں میں وہ ہوں جو وہاں ہے۔ اگر یہ کھڑکی نہ ہوتی تو میں تمہیں دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔ تم سے باتیں بھی نہیں کرسکتی تھی۔ دونوں طرف کھڑکیاں ہیں۔ قدرِ مشترک۔ اچھّا اب تم سناؤ۔

"ہاں۔کہیں دیر نہ ہو جائے۔سنو۔جب میرا سر دھڑ سے الگ ہوا تو وہ لوگ بہت خوش ہوئے۔انھوں نے میرے دھڑ کو پوپی کے پھولوں سے دھویا، اور پوپی کے بیج مجھے کھلائے۔پھر میرا دھڑ کنڈیشن کیا گیا، اور میں سارا کام ریفلکس کے تحت کرنے لگا۔اس میں کبھی غلطی ہوتی تھی تو ریفلکس پیدا کرنے والا خود اپنے کو ملزم گردانتا تھا۔میرے دھڑ کے فوری رسپانس کا کریڈٹ ہر ٹرینر لیتا تھا، اور انھوں نے میرے سر کو بیکار سمجھ کر سل میں ڈال دیا تھا۔شاید میرے لیے یہی بہتر تھا کیوں کہ مجھے صرف سر چاہیے تھا جس میں گردش کرتی ہوئی آنکھیں مجھے آسمانوں کے پرے اور زمین کے محور تک لے جاتی تھیں۔میں عارضی اجالے اور دائمی اندھیروں سے واقف ہو گیا تھا۔میں اڑتی ہوئی مرغابیوں کو بھی دیکھتا تھا اور رینگتے ہوئے کاکروچوں کو بھی۔سرخابوں کے معمولی چھروں سے شکار ہونے اور کاکروچوں کے نکلیر پروف ہونے کا منظر میرے سامنے تھا۔آسمانوں پر اڑتی ہوئی مردار دنیا اور زمین پر حرکت کرتی ہوئی لاشوں کو دیکھتا تھا تو مجھے آسمانوں کی دنیا سچی نظر آتی تھی۔وہاں آشتی کا گیت گانے والا ایلیمینیٹر نہیں تھا۔اور سنو۔میرے سر کے نیچے جو کچھ ہے میرا سایہ ہے۔ساکت۔غیر متحرک۔اور تمہارا۔"

"میری صرف رنگین آواز ہے اور ہونٹ ہیں اور آنکھیں ہیں۔

باقی سایہ ہے۔اور جو ہے وہ تم...." اور وہ ایک دم چپ ہو گئی۔

پہرے داروں کے فل بوٹ کی آوازیں آنے لگیں۔اس بار غیر متناغم۔رائفلوں کے میگزن کی جھنکار سنائی دی۔وہ پریزنٹ آرمس کر رہے تھے۔شاید گارڈس چینج ہو رہے تھے۔کسی نے گمبھیر آواز میں کاشن دیا۔

اب اپنی چال ریورس کرو۔تم ادھر سے روشنی ڈالتے ہوئے گزرو اور تم ادھر سے، تاکہ ایک سل میں اندھیرا ہو اور دوسرے میں روشنی، روشنی تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دی۔بہت تیز روشنی، شاید

بیٹری تبدیل کر دی گئی اور پہرے دار بھی۔ وہ دونوں کھڑکی سے
ہٹ گئے۔

ان کے رُخ مخالف سمتوں میں ہو گئے۔ وہ صرف آنکھوں کو اندھی
کرنے والی روشنی دیکھ سکتے تھے اور کچھ نہیں۔

ایک پہرے دار نے دوسرے کو آواز دی۔

"تمہاری طرف والی سیل میں کوئی ہے؟"

"ہاں کچھ نظر تو آ رہا ہے۔ زمین پر ایک سایہ سا"

"مجھے بھی دکھائی دے رہا ہے۔ ایک سایہ سا"

"اس کا رُخ کس طرف ہے؟"

"ٹراپک آف کینسر کی طرف"

"اور اس کا ٹراپک آف کیپریکارن کی طرف"

"ٹھیک ہے۔ اب یہ کبھی نہ مل سکیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے ماضی اور مستقبل
نہیں ملتے۔ روشنی بجھا دو۔"

○

# ریڈیو ایکٹیو

اور ایک رات دنیا کے سارے نکلیر ری ایکٹر ایک ساتھ پھٹ گئے۔ ساری زمین ریڈیو ایکٹیوٹی سے بھر گئی اور ہر جگہ شدید دھما کا ہوا۔

مجھے یوں محسوس ہوا کہ اذا زلزلت الارض زلزالھا کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ ساری زمین الٹتی ہوئی نظر آئی۔ پھر مجھے کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہوا؟

میں ایک غار کے نیچے سے نکلا۔

مجھے کوئی ہم جنس نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے چلنا شروع کیا اور چلتا چلتا ایک شہر میں پہنچا جہاں زندگی کے آثار تھے۔

میں نے سوچا کہ یہ لوگ کیسے زندہ بچ گئے۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا جو بھاگا جا رہا تھا۔ میں دوڑ کر اس کے پاس گیا۔ میں نے کہا اے بھائی بتا کہ میں کہاں ہوں؟

اس شخص نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا اور بولا۔

"تم اجنبی معلوم ہوتے ہو"

"ہاں بہت دور سے چل کر آیا ہوں۔ چٹیل میدانوں میں، ریگستانوں میں، پہاڑوں پر۔ مجھے کوئی جاندار نظر نہیں آیا۔

"ہاں، دنیا الٹ چکی ہے لیکن بیت المقدس زندہ ہے۔ تم اسی سرزمین پر ہو؟

"تم بھاگ کیوں رہے ہو؟"

"اس کی وجہ جاننا چاہتے ہو تو میرے ساتھ آجاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے بھاگنا شروع کیا۔ میں بھی اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔

میں ایک مقام پر پہنچا جہاں لوگوں کا جمِ غفیر تھا۔ میرا ساتھی لوگوں میں گھستا ہوا سامنے پہنچ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔

میں نے دیکھا کہ سامنے ایک سولی تیار کی گئی ہے اور کانٹوں کا تاج پہنے ایک شخص سولی پر چڑھا ہوا ہے۔

میں نے پوچھا "یہ کون ہے؟"

"یہ پانٹیس پائلٹ ہے"

میں نے ایک دوسرے شخص کو دیکھا جو رسّی کا سرا پکڑے ہوئے تھا۔

میں نے پوچھا "یہ کون ہے؟"

"یہ مسیح الدورہ ہے۔"

میں نے کہا "یہ کیسے ممکن ہے۔ پانٹیس سولی پر اور مسیح سولی دینے والا۔"

"ہاں۔ یہ جان دیتا نہیں جان لیتا ہے، اور پانٹیس پائلٹ جان لیتا نہیں بلکہ جان دیتا ہے"

"یہ تو بائیبل میں نہیں لکھا ہے"

"تم اس بائبل کی بات کر رہے ہو جو ریڈیو ایکٹیو نہیں تھی۔ اب بائبل بھی ریڈیو ایکٹیو ہے اور ہم بھی ریڈیو ایکٹیو ہیں۔ اب ہمیں ری ایکٹر کی ضرورت نہیں۔ اب ہم خود پاور جنریٹ کرتے ہیں، اور یہ مسیح مریم کے بطن میں پڑنے والے روح القدس کی اولاد نہیں بلکہ ریڈیو ایکٹیو میٹیریل کی اولاد ہے۔"

اور میرا جسم ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔ لیکن میں وہی تھا جو پہلے تھا۔ صرف یہ کہ اب میں چل نہیں سکتا تھا بلکہ بھاگ رہا تھا اور بھاگتا جا رہا تھا۔

○

# سنتان (۱)

ونکٹ چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے بیٹھ کر اپنے جوتے اتارے اور انھیں اپنے جھولے میں رکھ لیا اور پھر پہلے سے زیادہ تیز چلنے لگا۔ سوندھی کو بڑا تعجب ہوا۔ وہ چمڑے کا بوٹ پہنے ہوئے تھا مگر خاردار جھاڑیوں میں زمین پر گرے ہوئے کانٹوں کو دیکھ کر اسے ڈر لگ رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ کانٹے اس کے جوتے کے ڈیڑھ سینٹی میٹر موٹے تلے کو پار کر کے اس کے پیروں کو زخمی کر دیں گے۔ ونکٹ کو کانٹوں بھرے راستے پر تیزی سے چلتے دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

"ونکٹ۔ اگر تمہارے پیروں میں کانٹے چبھ گئے تو میں کیا کروں گا۔ مجھے تو راستہ بھی نہیں معلوم؟"

ونکٹ نے قہقہہ لگایا۔

ہم ان خاردار راستوں پر چلنے کے عادی ہیں۔ زخمی ہونا، چلنا اور چلانا ہماری جین میں ہے۔ ننگے پاؤں اور ننگے بدن زمین کی گریویٹیشن (GRAVITAION) کو کم کر دیتے ہیں اور ہم اپنے کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہیں۔

"LIKE THE ORIGINAL ANCESTORS, YOU KNOW"

سوندھی اب پہلے سے زیادہ تیز چلنے لگا تھا کیوں کہ کسی نہ کسی طرح اسے اپنے تیز رفتار دوست کا ساتھ دینا تھا۔ یہ بات اور تھی کہ ساتھ دینے کی خواہش میں دشوار گزار اور انجانے راستوں میں کھو جانے کے ڈر کا عنصر غالب تھا، اور جب

ونکٹ نے بیابان میں بنی ہوئی کٹیا میں دم لینے کا فیصلہ کیا تو سوندھی کی جان میں جان آئی۔ ونکٹ نے جو پرکھوں اور رنگوں اور کشش والی بات کی تھی وہ سوندھی کے دماغ میں گھوم رہی تھی۔ مگر وہ اتنی تیزی سے بھاگ رہا تھا کہ ونکٹ سے کچھ وضاحت طلب کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اب اس کی سانس کی رفتار نارمل ہو چکی تھی اور اس نے اپنے سینے کا بوجھ اتارنا چاہا۔

"وہ جو تم نے جین اور پرکھوں والی بات کی تھی وہ کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔"

ونکٹ چند لمحے خاموش رہا۔

یہاں سے تقریباً ایک سو کلو میٹر پر ایک مندر ہے۔ اس پہاڑی کے پیچھے، وہاں چلتے ہیں۔ میں اپنے پرکھوں یا جین کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ میں نے ایک سنا سنایا جملہ دہرایا تھا۔ اس مندر میں پرانا لٹریچر ہے اور اسے پڑھنے اور سمجھنے والے ایک پروہت"

پروہت کو آج کوئی کام نہیں تھا۔ ویسے وہ اتنے کارآمد تھے کہ ان کا کام کوئی خاص نہیں تھا۔ ہاتھ کی لکیریں، جنم کنڈلی، کیلنڈر، پوجا، بیاہ، کریا کرم، بانجھوں کی گود، ماؤں کی ممتا، برگد کا بھوت، سبھی کچھ ان کے دائرہ کار میں آتا تھا۔ لیکن آج صبح سے کیرتن کر رہے تھے اور ونکٹ کی بات سن کر بولے۔

"یہ سب باتیں کیوں پوچھتے ہو۔ یہ سب تو پرانی باتیں ہیں۔ کچھ حقیقت، کچھ فکشن، اور جین تو ایک ہی ہے اور اگر وہ وقت کے ساتھ تبدیل ہو گئی تو پھر اس کی باتیں کرنی بیکار ہیں، رہ گیا پرکھوں کی بات تو کتنی دور تک جاؤ گے؟"

"اجودھیا تک۔ ہمالیہ پہاڑ اور صحرائے گوبی اپنے بس کی بات نہیں۔"

پروہت نے مورتی کے نیچے بنے ہوئے تہہ خانے سے کچھ نیم بوسیدہ پوتھی نما کاغذ نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔

"اور پھر ہنومان جی اپنا منہ دوسری طرف کر کے کھڑے ہو گئے اور ان کی لمبی دُم اوپر اٹھ گئی اور وہ بڑے اُنکس نظر آنے لگے۔ سری رام چندر جی بولے کہ اے ہنومان ہمارے پرکھوں کی غلطیوں کا ذمے دار مجھے کیوں ٹھہراتے ہو۔ مانتا ہوں کہ تم کو گھروں سے

دوڑ کر پہاڑوں اور درختوں اور کھائیوں میں بھاگنا پڑا اور پھر تم سب یہاں بس گئے اور ان سے ادھار لی ہوئی شیوجی کی مورتی اپنے گھروں میں رکھ لی، اور اے ہنومان ہمارے پرکھوں نے پریاگ بنایا اور اجودھیا بنایا اور پاٹلی پتر بنایا۔ پرنتو اے ہنومان اس وقت تو میں بھی مصیبت میں ہوں، تم میری سہائتا کرو اور پھر ہنومان جی کا کرودھ سماپت ہو گیا اور وہ اپنے پرکھوں پر کیئے گئے اکرمتر اور انیائے بھول گئے اور سری رام چندر جی کے سہایتی بنے اور دوسرے دم دار ساتھیوں کو بلا کر پتھر اور مٹی اور گرے ہوئے درختوں سے کھائی پاٹ دی اور رام چندر جی سے پار اترنے کو کہا اور رام چندر جی اکیلے جاتے سے بہت ڈر رہے کیوں کہ ان کے پاس صرف ایک کمان تھی اور دوسری طرف وھیل اور ہاتھی کے کراس کی نسل بلّم اور ترشول سے مسلح تھی، لیکن سری رام چندر جی کے سہایتی نے دُم میں کپڑا باندھ کر جزیرے میں آگ لگا دی اور سب وھیل اور ہاتھی کے کراس کی نسل اپنا بلّم اور ترشول چھوڑ کر بھاگی، اور رام چندر جی سیتا جی کو وھیل راجہ کے محل سے نکال لائے۔ پرنتو جب رام چندر جی نے سیتا جی کے اچھوت پن پر شک کیا اور دھرتی پھٹی اور اس نے سیتا جی کو اپنے شرن میں لے کر سچ جھوٹ اور شک کو ہمیشہ کے لئے دبا دیا تو ہنومان جی کو بہت دکھ ہوا اور وہ سری رام چندر جی سے بولے کہ اے شیوجی کے اوتار میں اب تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ سری رام چندر جی نے وجہ پوچھی تو ہنومان جی بولے کہ اے سری رام چندر جی میں تو تمہارا سہایتی اس لئے بنا تھا کہ ست کی وجہ ہو لیکن تمہارے شک نے ست پر چھایا کر دیا اور دھرتی نے ست کو مٹا دیا، اور اب مجھے معلوم ہوا کہ تمہارا اکرمتر سیتا جی کو لینے کے لئے تھا اور واپس لا کر ان پر الزام لگانے کے لئے تھا تو اے رام چندر جی اب تم اکیلے واپس جاؤ۔ اب میری دُم بھی جل چکی ہے اور میری نسل میں بے دم کے لوگ پیدا ہوں گے۔ اس لئے میں کسی اور اکرمتر میں تمہاری سہایتا نہیں کر سکتا، اور اے رام چندر جی اب میں ان وھیل جیسی آنکھوں والوں کے درمیان رہوں گا اور اب مجھے پراشچت کرنے کی بھی ضرورت نہیں کیوں کہ میں اپنی

دُم گنوا چکا ہوں اور سری رام چندر جی اپنا بن باس ختم کر کے اجودھیا واپس لوٹے اور وہ اکیلے تھے۔ سری ہنومان جی جزیرے میں رہ گئے اور ان کی نسل بڑھی اور انھوں نے اپنے پُرکھوں کا بنایا ہوا پُل توڑ دیا اور سمندر میں ناؤ چلانے لگے۔ ہنومان جی نے رام چندر جی کے بتائے ہوئے شبد اور ودّیا جزیرے کے لوگوں کو سکھا دئے ہیں؟

پروہت نے آخری جملہ دھیرے دھیرے گا کر ادا کیا اور پوتھی بند کر دی۔

سوندھی نے ونکٹ کی طرف دیکھا۔

ونکٹ سوندھی کا مطلب سمجھ گیا۔

"بس پنڈت جی۔ آگے کچھ نہیں"

"آگے بھی ہے مگر مجھے اس کے لئے دوسری پستک دیکھنی پڑے گی اور ابھی مجھے بہت کام ہے، تم کل آنا!"

"پروہت جی پہلے ہی سے بوسیدہ کاغذوں والی پوتھی لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ونکٹ اور سوندھی کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"بڑا کشٹ اٹھانا پڑا۔ یہ پستک تو کسی نے مدّتوں سے دیکھا تک نہیں۔ اسے تو بیکار سمجھ کر ایک کونے میں ڈال دیا گیا تھا اور اگر میں نے اسے بچائے نہ رکھا ہوتا تو یہ کب کی کوڑا کرکٹ کے ساتھ جلا دی گئی ہوتی۔ بس خیریت ہوئی کہ شیواجی مہاراج کے آدمی یہاں تک نہیں پہنچ سکے"

اور پھر پروہت نے پستک کھولا اور گانا شروع کیا۔

"سری رام چندر جی کے اوتار نے کپل وستو میں جنم لیا۔ اوتاروں کا استھان بہت اونچا ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ اونچے گھر میں جنم لیتے ہیں۔ برہمن، چھتری، راجہ مہاراجہ کے یہاں، اور نئے اوتار ریدھشٹر راجہ کے گھر پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنا راج پاٹ پھیلانے کے لیے راج محل چھوڑ دیا۔ جیسے سری رام چندر جی

کے کھڑاؤں نے سنگھاسن پر راج کیا تھا اور خود سری رام چندر جی جنگلوں میں بھٹکتے رہے تھے۔"

اس کے بعد برہمت جی نے گانا بند کر دیا اور روزمرّہ میں واقعہ سنانے لگے۔ پھر یدھشٹر اتے اپنی پالیسی بدل دی اور ہنسا سے اہنسا کا پرچار کرنے لگے اور مہاتما کہلائے۔ ان کے چیلوں نے بہت زور دور تک ان کا آدرش پہنچایا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر گھنے جنگلوں میں، چٹیل میدانوں میں، مانجھیوں میں، راجہ پرجا میں۔ پرنتو ان کا آدرش ان کے اپنے لوگوں میں زیادہ دن نہ چل سکا۔ لوگوں نے وھیل اور ہاتھی کی نسل والوں سے ترشول لے لیا۔ ہمالے کے اس پار جاکر تلوار لائے۔ ہنومان جی کی اُٹھی ہوئی دم جیسا گرز بنایا اور اہنسا والوں کو ان ہتھیاروں سے ڈرا دھمکا کر دیش نکالا دے دیا۔ پھر رام چندر جی کے اکلوتے والے جزیرے میں ہنومان جی کی نسل والوں کو ان کے پُرکھوں کے کارنامے یاد دلائے اور ہنومان جی کی دم جیسا گرز ان کے حوالے کر دیا اور بولے کہ اے ہنومان جی کی سنتان تم کبھی وھیل اور ہاتھی کے کراس والی نسل میں نہ ملنا کیوں کہ یہ مفتوح نسل ہے اور تم فاتح ہو اور یہ سیتا جی کو بھگا لے جانے والے ہیں اور تم لوگ سری رام چندر جی کے سہایتی کی نسل ہو جنھوں نے سیتا جی کو بھی دھرتی کا نوالہ بنا دیا۔ پھر ایسا ہوا کہ رام چندر جی کے کپل وستو والے اوتار کی بات ہنومان جی کی سنتان نے بالکل نہیں مانی لیکن وھیل اور ہاتھی کے کراس والی نسل نے جن کے پاس اب وھیل کی آنکھوں کے علاوہ کچھ نہیں بچا تھا۔ سری رام چندر جی کے کپل وستو والی بات کو مان لیا اور اس طرح ہنومان جی کی بے دم والی نسل نے رام چندر جی سے رشتہ توڑا اور جزیرے کے وردھی نسل نے رام چندر جی سے ان کے اوتار کے ذریعے رشتہ جوڑا، اور اے سجنوں اور مہیلاؤ جب تم اس پستک کو پڑھ رہے ہوگے تو سری رام چندر جی کے اجودھیا اور ان کے اوتار کے کپل وستو میں دو ہزار دم دار ستارہ سال کا فرق ہے اور کپل وستو والے اوتار کے ترٹی پار ہونے کو ڈھائی ہزار سال ہوئے اور اتنے دنوں تک ترشول اور تلوار اور گرز ہنومان جی کی سنتان کے مال گدام

میں بند تھا اس لئے اس میں زنگ لگ گیا تھا اور آگے جو ہوا یا ہونے والا ہے اس کی پیشین گوئیاں مہارشی نربدا نے کی تھی اور اس کا بیان ص۸۶ پر ہے۔

پروہت جی نے پوتھی ونکٹ کے ہاتھ میں دی اور بولے کہ تم ص۸۶ نکالو اور میں جاتا ہوں اور انھوں نے بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں دکھائیں۔ ونکٹ نے ص۸۶ کھولا اور بڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ سوندھی بھی ونکٹ کے ساتھ اس صفحے پر نظر دوڑاتا رہا۔ پروہت تھوڑی ہی دیر کے بعد واپس آئے اور پستک ونکٹ سے لے لی۔ ونکٹ نے کہا کہ اے پروہت جی میں نے ص۸۶ تو کھول دیا کیوں کہ میں اس نمبر کو پڑھ سکتا ہوں مگر اس کے آگے کچھ نہیں پڑھ سکتا۔ اے پروہت جی کیا آپ یہ بتانے کا کشٹ کریں گے کہ یہ کس بھاشا میں ہے۔ پروہت جی بولے کہ اے ونکٹ بھاشا تو وہی ہے جو تمہیں بھی معلوم ہے مگر یہ پستک کوڈ میں ہے اور اسے میں جانتا ہوں یا پھر پرباگ کے گیانی۔

پروہت نے صفحہ ۸۶ پڑھنا شروع کیا۔

مہارشی نربدا پنڈت بھدر آسن جمائے اور آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ سری رام چندر جی ہنومان جی کے ساتھ نربدا اور تاپتی کے سنگم کے پاس والی گھاٹی سے برآمد ہوئے اور بولے اے ہنومان ہم نے تمہاری بات اس لیے مانی تھی اور اکیلے اجودھیا لوٹ گئے تھے کہ تمہاری اگنی گاؤ نسل سارے جزیرے پر پھیل جائے گی۔ لیکن اے ہنومان تمہاری نسل نے ہماری اِچھّا کا پالن نہیں کیا اور جب تم نے دو ہزار کومتی سال بعد بدھشترا کے روپ میں جنم لیا اور جیو ہتیا کو پاپ بتایا تو اس وقت بھی تمہاری نسل نے ہمارے آدرش کو نہیں مانا اور ان لوگوں کی نسل نے جو ہماری استری کو اٹھا لے گئے تھے ہماری بات مان لی اور ہم ان کی پراشچت سے پرسن ہوئے، پرنتو اے ہنومان اب ہم چاہتے ہیں کہ تم جیو ہتیا کے آدرش کو جزیرے سے بھی دیس نکالا دے دو کیوں کہ منش کی سنتان بہت بڑھ گئی ہے اور ان کے لیے دھرتی سے اتنا اناج نہیں اُگ سکتا، اور اے ہنومان یہ بھی ٹارلیس کے پچاسویں تیر کے بعد دھرتی سے جو کچھ اُگے گا وہ صرف دیوتاؤں کے لئے ہوگا اور عام آدمی اسے ہضم نہیں کر سکے گا، اور اے ہنومان یہ کام جلدی ہونا چاہئے اور تم اپنا گرز

اور وھیل کی نسل والوں سے چھینا ہوا ترشول اپنی سنستان میں بانٹ دو اور تم اولمپیا جاکر آریز (ARES) کو میرا خط دے دینا وہ جس کو کہے ٹاور پر بیٹھا دینا اور تم سپھل ہوگے، اور پھر مہارشی پنڈت نے دیکھا کہ ہنومان جی اُچھلتے کودتے آن کی آن میں اولمپیا پہنچے۔ آریز نے کہا کہ اے ہنومان میں بھی رام چندر جی کا بھگت ہوں مگر میں ہمیشہ پہاڑ پر رہتا ہوں اور ابھی مجھے بہت کام ہے۔ کبھی اوقیانوس پار کرتا ہوا دکھن کے دیشوں میں جاتا ہوں تو کبھی بحرالکاہل کا چکر لگاتا ہوں۔ کبھی یورپ کی پہاڑیوں میں بھاگتا رہتا ہوں اور کبھی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے لئے اپنے جارکی وایو کو ہدایت جاری کرتا ہوں اور مجھے خود نہیں معلوم کہ کب اس اولمپیا پہاڑ کی گھاٹی میں میری ضرورت پڑجائے، تو اے ہنومان تم ایسا کرو کہ خود سری رام چندر جی کے علاقے میں کسی کو تلاش کرو۔ ہنومان جی بولے کہ اے آریز ہمارے علاقے میں یہ کام برہمانے دیوتا کے بجائے دیوی کے سپرد کر دیا ہے اور تم جانتے ہو کہ دیوی کے دو روپ ہوتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ اب واپس جاکر دیکھتا ہوں کہ دیوی کے تمہارے جیسے روپ کو کب سپھلتا کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اور ہنومان جی ہمالیہ پہاڑ کے نکٹ گھومتے رہے اور پھر گنگا میں اشنان کرتے اور جمنا کے کنارے بیٹھے رہتے۔

اور پھر مہارشی نربدا نے دیکھا کہ مہاکالی سری رام چندر اور ہنومان جی کے بنائے ہوئے پُل کی جگہ سورج استھان کی اور منہ کر کے بیٹھی ہیں اور ان کے منہ کے دونوں طرف سے خون کی دھار نکل کر سمندر کے پانی کو لال کر رہی ہے۔

پروہت چپ ہوگیا۔ ونکٹ اور سوندھی کٹیا سے باہر آئے۔

سوندھی بولا۔ تم دکھن کی طرف جاؤ۔ میں اُتر کے لئے ٹیکسی پکڑ لیتا ہوں۔ پروہت نے کٹیا کے در سے پکار کر کہا۔ ابھی تو تیسری پستک باقی ہے۔

کیا ہنومان جی اپنے قبیلے کے ساتھ پل پر سے اُتر کر سری لنکا پہنچے تھے؟ اور کیا وہ قبیلہ سری لنکا میں آباد ہوا اور پھر مہا کالی نے ہنومان جی کی سنتاں کو خون کی ہولی کھیلنے کی ترغیب دی؟ کون جانے؟ سنتانوں کے عمل کا تعلق تاریخ سے کہاں ہوتا ہے۔ ہماری سوچ یک زمانی ہے اور ہم تاریخ کو اپنے طور پر معنی پہنا کر اسے اسطورہ بنا دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں اساطیر بھی تو تاریخ۔ اور تاریخ ایک عرصے کے بعد اتنی پریمیٹیو لگنے لگتی ہے کہ تاریخ اور اسطورہ کا فرق مٹ جاتا ہے۔ کیا حقیقت ہے کیا خرافات، کون جانے۔

# سنتان (۲)

ونکٹ نے پروہت کی بات سن کر اُتر کی اُور دیکھا اور سوندھی نے دکھن کی اُور۔ دونوں نے ایک دوسرے کو آنکھوں کا اشارا کیا اور دونوں پھر ایک ساتھ چل پڑے۔

"آگے کیا ہوگا؟"

"پتہ نہیں۔ شاید یہ کہ خون کی دھار کہاں تک پہنچی؟"

"اور شاید یہ کہ دیوی نے کب استھان بدلا؟"

"اور یہ کہ ہنومان جی کو رام چندر جی کے آدرش کا پالن کرنے کے لئے کیا کرنا پڑا؟"

"یا پھر یہ کہ....."

اور دوسرے دن جب وہ کٹیا میں پہنچے تو پروہت پہلے ہی سے ایک کتاب لئے بیٹھا تھا جس پر موٹے موٹے اکھروں میں لکھا تھا "ہنومان کتھا بھاگ ۳" ونکٹ اور سوندھی کو دیکھ کر پروہت نے سر ہلایا اور بولا "میرے ہردے کو بڑا کشٹ پہنچا۔"

"کیوں؟"

"تیسرا بھاگ پڑھ کر معلوم ہوا کہ رام چندر جی کے سہایتی کی سنتان پاکھنڈی ہوگئی۔"
ونکٹ اور سوندھی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر دونوں تقریباً ایک ساتھ بولے۔

"دوسری پستک کے آخر میں تو لکھا تھا کہ ہنومان جی نے رام چندر جی کے کہنے سے اپنا گرز اور وھیل اور ہاتھی کی نسل سے چھینا ہوا ترشول اپنی سنتان میں بانٹ دیا اور باقی

کام مہا کالی نے کیا؟

" اور کالی کے منہ سے خون کی دھار نکلنے والی بات؟" ونکٹ نے کہا۔ پروہت نے ہاتھ کے اشارے سے سوندھی اور ونکٹ کو چپ رہنے کے لئے کہا اور کتاب کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

" اور پھر یوں ہوا کہ اہنسا کی پالن ہار وھیل اور ہاتھی کی کراس نسل نے راج نیتی کے تحت ہنسا کو اپنایا اور ہنومان جی کے بانٹے ہوئے ترشول اور گرز سے اپنا بچاؤ کرتے رہے اور اپنے سنگھاسن کا بچاؤ کرنے کے لیے وھیل کی کھال اور ہاتھیوں کا سونڈ لے کر ہنومان جی کی نسل پر پل پڑے۔ مہا کالی رام چندر جی کے پل پر بیٹھی ہوئی چاروں اُور اپنے منہ سے خون کی دھارائیں نکالتی رہی۔ یہاں تک کہ سارا سمندر لال ہوگیا اور سمندر کی ساری مچھلیاں لال ہوگئیں۔ وھیل اور ہاتھی کی کراس کی نسل کو اپنا سنگھاسن ہلتا ہوا دکھائی دینے لگا اور ہاتھی اور وھیل کی طاقت ان کو سنبھلنے نہ دے سکی اس لئے کہ ہنومان جی کی سپلائی لائن بہت چھوٹی تھی اور ان کے گدام میں ترشول بہت تھے۔ رام چندر جی کو اس بات کی چنتا تھی کہ کہیں وھیل اور ہاتھی کی نسل پھر سے طاقت ور ہو کر لکشمی ریکھا کو پار کرنے اور سیتا جی کو دھرتی کی گود میں جانے پر مجبور نہ کر دے اور ہنومان جی کا گرز بیکار نہ ہو جائے کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ وھیل اور ہاتھی کی کراس نسل نے اپنے فائر بریگیڈ کو غیر ملکی ٹریننگ دے رکھی ہے اور اب ہنومان جی اپنی دُم میں کپڑا باندھ کر آگ نہیں لگا سکتے کیوں کہ اوّل تو ان کی دم جل چکی ہے۔ دوسرے یہ کہ شہر جنگل سے دور ہیں اور مکانات بہت اونچے ہیں اور سیمنٹ اور لوہے کے بنے ہوئے ہیں۔ رام چندر جی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ہنومان جی کی نسل کے لیے اپنے گدام کھول دیں اور ان کو ہر وقت نک اپ کرتے رہیں۔ رام چندر جی نے اپنی آریائی رحم دلی کا مظاہرہ کرنے کے لیے ڈائے ڈے لس (DIADALUS) کے پاس سندیسا بھیجا اور بولے کہ اے دیوتا، دیوتائی رشتے سے ہم ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ہم دھرتی کو ماتا سمجھ کر اس کی چھاتی سے لپٹے رہے اور تم نے اپنے بیٹوں کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ سپیس کا چکر کاٹیں اور اب

ہمارے پاس دالیں تو سب کے سب ادھار ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اپنے سہایتی کی چھ ہزاریوں سنتان سے اپنے گٹھ جوڑ کا مظاہرہ اس طرح کریں کہ لوگوں کو ہمارے دیالو کشکول میں چاول نظر آئے۔ لیکن اسی بہانے ہمارا ارادہ بھی ہنومان جی کی سنتان ور دھیوں پر اچھی طرح اُجیت ہو جائے اور دھیل اور ہاتھی کی نسل ہنومان جی کی سنتان کو وہ دے دے جو اصل میں ہمارا ہوگا اور اس طرح ہم دھیل اور ہاتھی کی نسل پر جو پہلے کئی بار ہمارے دشمنوں کی سہایتا کر چکے ہیں پوری طرح اپنا ادھیکار جما سکیں گے اور ڈائے ڈے لس نے رام چندر جی کے دُودسے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے تو دُود نے کہا کہ رام چندر جی کو آئی کیرس کے وہ پر چاہئیں جو گوند کے بجائے سیمنٹ سے جڑے ہوں اور جو سورج کی گرمی سے نہ پگھلیں۔ ڈائے ڈے لس نے رام چندر جی کی اچھا پوری کی اور آئی کیرس کشکول میں چاول بھر کر دھیل اور ہاتھی کی کراس والی نسل کے سروں پر اڑتا اور ان کو بہت ڈرایا دھمکایا۔

دھیل اور ہاتھی کی کراس والی نسل نے بہت شور مچایا مگر وہ دل میں بہت ڈرے اور انھوں نے اہنسا اور ہنسا والیوں کی ایک پنچایت بلائی جس میں ان کے سرپنچ نے ایک بھاشن دیا۔

"میرے پیارے دوستو۔ ہم نے اہنسا کا پالن کیا اور بہت دنوں تک اپنے کو دشمنوں سے دور رکھا اور اپنی روایتی مہمان نوازی سے جو رام چندر جی کے اکرڈٹر کے بعد ہمیں سکھائی گئی تھی ہم نے سب کو اپنایا اور ہر طرح کے مت بھید سے گریز کرتے رہے۔ ویسے ایک بات ہے" اور یہ بات سرپنچ نے آواز دھیمی کرکے اور رازدارانہ لہجے میں لوگوں کو بتائی "وہ یہ کہ ہمارے دلوں میں ڈر بھی سمایا ہوا تھا اور یہ ڈر ازلی ابدی (ARCHETYPAL) ہے جو ہماری سنتان میں ہزاروں سال سے چلا آرہا ہے" اور پھر وہ اونچی آواز کرکے نارمل طریقے پر واپس آئے۔

"تو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ہماری فراخ دلی اور سب کو تو پسند آئی مگر ہنومان جی کی سنتان کو جو سیتا جی کی دھرتی میں جانے کے بعد سے ہمارے مہمان رہے اچھی نہیں

لگی، اور یا پھر کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے جسے میں اور شاید آپ بھی جانتے ہیں مگر اسے بھانشٹر کے ریکارڈ میں شامل کرنا راج نیتی نہیں ہے۔ بہر حال ہنومان جی کی سنتان نے ہنسا کو اپنایا اور پھر ہم نے بھی پہلے اہنسا اور پھر ہنسا کو اپنایا لیکن ہم کیا کرتے۔ رام چندر جی کے مال گدام ہنومان جی کی پرانی خدمات کے صلے میں کھول دیئے گئے۔ پل کی ضرورت نہیں تھی اس لئے کہ سمندر دیوتا سے معاہدہ کر لیا گیا تھا پھر ہماری گیدڑ بھبکی اور ہمارے ترشول اور ہماری پھیلی ہوئی باہیں کسی کام میں نہ آئیں اور ہم نے رسک لیا،" تالیاں

" ڈائنا سورس کی سنتان نے ہمیں کلکولیٹیڈ رسک (CALCULATED RISK) کا پاٹھ بہت پہلے پڑھایا تھا اور اسے ہم نے اپنی ریفرنس بک نکال کر پھر سے دیکھا اور پھر کلکولیٹ کیا۔

ہم ہنسا سے سمسیا حل نہیں کر سکتے۔

ہم اہنسا سے دور ہو کر اپنے دھرم کو نشٹ کر رہے ہیں۔

ہمیں مال گدام کا دروازہ ضرور بند کرنا ہے۔

اور جب تک دروازہ بند نہیں ہوتا ہمیں پھلتا نہیں مل سکتی اور ہمارے سامنے دو حل تھے۔ ہنومان جی کی سنتان سے جدھ یا رام چندر جی کی سنتان کی مہمان نوازی اور ہم نے مہمان نوازی کو جدھ پر ترجیح دی"۔

" پنڈت چپ ہو گیا اور کتاب الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ونکٹ بولا۔

" پھر کیا ہوا پنڈت جی؟"

" آگے کے حرف مٹے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں سے کچھ پڑھائی دیتا ہے۔ مگر مطلب سمجھ میں نہیں آتا"

" پڑھیے شاید ہم لوگوں کی سمجھ میں کچھ آئے"

دس بارہ لائنوں کے بعد لکھا ہے " اور میں کرک شیتر میں ننگی ہو جاؤں ۔ تم سب چلے جاؤ گے تو دریودھن سے کون نپٹے گا"۔ پھر آدھے پنے کے بعد لکھا ہے۔

اور سنسکرت میں۔

"میں جو ہوں۔ رام چندر جی کا اوتار۔ میں سنبھال لوں گا۔" اور ایک پتے کے بعد پھر اتفاق رائے ہو گیا۔ مال گودام سے تیر کمان اور ترشول نکال کر گرز وہیں چھوڑ دیا گیا۔ کیوں کہ گرز چلانا صرف ہنومان جی کی سنتان کو آتا تھا اور رام چندر جی کی سنتان تیر کمان چلانا جانتی تھی اور ترشول تو ملٹی پرپز (MULTIPURPOSE) ہے۔

"اور ایسا ہوا کہ سنتانوں کی جنگ کی بجائے راج نیتی کی جنگ شروع ہو گئی۔"

"جیت کس کی ہوئی؟" سوتو جی نے پوچھا۔

"یہ تو نہیں لکھا ہے۔ ہاں ایک پتے پر آدھے میں سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں اور آدھے میں اُلٹے سیدھے۔" یہ کہہ کر پردیت نے پتا اُلٹ دیا اور پڑھنا شروع کیا۔

اور پھر رام چندر جی کے اوتار وحیل اور ہاتھی کی سنتان کے دیش میں داخل ہوئے۔ جہاں کالی نے تین سو ساٹھ ڈگری کا دائرہ بنایا اور متر نیچے کی طرف کر کے سمندر کے ساحل پر براجمان ہو گئی۔ رام چندر جی کے اوتار نے اجودھیا اور کاشی کی بھگتیا کا مالک بھی لیا اور اپنے ساتھیوں کو بہا دیا اور سب ہنومان جی کی سنتان پر پل پڑے۔ ہنومان جی کی سنتان کو تعجب ہوا اور جلدی جلدی شیو جی کے مندر میں جا کر پرانا ریکارڈ تلاش کرنے لگے تاکہ ماسک پوشوں کو بتائیں کہ وہ اپنے پرکھوں کے بھائیوں کی ہتیا کر رہے ہیں مگر وہ ریکارڈ انھیں نہ مل سکے اور جب ہنومان جی کی سنتان نے جو سمندر پار کرنے کے بجائے اپنے پرانے استھانوں پر رہتی تھی اور رام چندر جی کے مال گودام میں کام کرتی تھی اور مال گودام بند ہو جانے پر بے کار ہو گئی تھی۔ اس بات کا شکوہ کیا کہ پرکھوں کے سنتان پر جنھوں نے مال گودام کے آسرے پر وحیل اور ہاتھی کی نسل سے جدھ مول لی تھی۔ اب خود مال گودام والے پل پڑے ہیں تو رام چندر جی کے اوتار کے سیوکوں میں نے کہا کہ پرانے ریکارڈ کون دیکھتا ہے اور پرانی باتیں کون یاد رکھتا ہے اور اصول اور ست اور سورکھا اور وضع داری کی جگہ راج نیتی نے لے لی ہے اور اب بہتر یہی ہے کہ جدھ بند کر دو۔ مال گودام سے نکلے ہوئے تیر کمان اور ترشول اور دُم میں باندھنے والی آگ بھڑک کر پھر سے واپس مال گودام میں جمع کروا دو ہماری جے جے کار کرو جیسے

وھیل اور ہاتھی کی نسل نے ہماری جے جے کار کی تھی۔ اسپوکس مین نے کہا کہ اے رام چندر جی کے اوتار پہلے تو ہمارے پُرکھوں نے آپ کی سہائتا کی تھی اور ہمارے سامنے وھیل اور ہاتھی نے اپنے تھوتنے اور سونڈ زمین پر رگڑے تھے اور آپ کے ساتھ ہماری بھی جے جے کار ہوئی تھی اور آپ ہم سے کہہ رہے کہ ہم آپ کی پناہ میں آئے ہوئے وھیل اور ہاتھی کی نسل کے سامنے علی الرغم ہو جائیں تو اے رام چندر جی کے اوتار یہ ہم سے کیسے ہو سکتا ہے اور مہاکالی نے اوپر کی طرف دیکھا اور اس کے منہ سے خون کی دھار نکلی لیکن سمندر میں گرنے کے بجائے منہ کے دوسرے اور سے مہاکالی کے منہ میں واپس چلی گئی۔ دریودھن نے نیا جنم لیا۔ دروپدیوں کی روحیں اپنے بدن میں داخل ہو کر ننگی ناچنے لگیں۔ کرشن بھگوان، دوارکا میں سمندر کے کنارے مچھلی کا شکار کرتے رہے اور جدھ میں بھاگ لینے سے انکار کر دیا، اور جب رام چندر جی کا سندیسا ان تک پہنچا تو انھوں نے دورے کہا کہ میں صرف ایسی جدھ میں حصّہ لیتا ہوں جو جھوٹ کو نشٹ اور سچ کو استھاپت کرنے کے لئے ہو، اور ست کو استھاپت کرنے میں رشتوں کا خیال نہیں کیا جاتا مگر یہ لڑائی تو راج نیتی استھاپت کرنے کے لیے ہے۔ اس میں تو نہ جھوٹ کی پہچان ہے نہ سچ کی۔ اس لئے کہ اب مہابھارت اور رامائن میں لکھا ہوا سچ اس جگ سے رخصت ہو چکا اب راج نیتی کے معیار پر پورا اترنے والا سچ ہے اور باقی جھوٹ، اور اے رام چندر جی کے دوت اب میں دھرتی کے ریف ناٹ والے گٹھ بندھن اور ست کے پالن سے الگ ہو کر صرف مچھلی پکڑتا ہوں بلکہ یوں سمجھو کہ مچھلی خود میرے جال میں پھنس جاتی ہے، اور یہ کہتے کہتے سری کرشن جی پر القا کی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ اپنی دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو گئے اور آکاش کی اور دیکھ کر کہنے لگے۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ سمندر کی مچھلیوں نے میٹنگ میں فیصلہ کیا کہ ہم مچھیرے کے جال سے بچ نہیں سکتے اس لیے ایسی اُپائے کرنی چاہیئے کہ مچھیرا خود ہمارے جال میں پھنس جائے اور پھر مچھلیوں نے مل کر مچھیرے کو پکڑ لایا اور وہ ندی میں کود پڑا اور جال اس کے چاروں طرف لپٹ گیا اور اب مچھلیاں ریڈیس اور چٹانوں میں بیٹھ کر مچھیرے کے جال میں تڑپنے

کا تماشہ دیکھتی ہیں اور پھر کرشن جی اپنے بھگوانی گیان سے جاگ اٹھے اور بولے "بھاگو یہاں سے، تم میرا امن خراب کرو گے" اور یہ کہہ کر دود کی طرف لپکے۔ دود بیچارہ اپنی گٹھری اٹھا کر بگٹٹ بھاگا۔

پنڈت پھر خاموش ہو گیا۔

سوندھی نے پوچھا "ہاں پنڈت آگے کیا لکھا ہے؟"

پنڈت نے غور سے دیکھا اور بولا۔

آگے کچھ مٹے اور بنے اچھروں میں لکھا ہے جیسے کوئی جلدی میں لکھ کر بھاگ گیا ہو۔

"کوشش کرو۔ کیا پڑھا جاتا ہے؟" ونکٹ نے کہا۔

پنڈت نے پڑھنا شروع کیا۔

اب آگے لکھنا مشکل ہے۔ مہاکالی نے اشنان کا فیصلہ کیا اور چاروں طرف گھوم گھوم کر اشنان کر رہی ہے۔ اس کے خون کی دھار پورب پچھم اتر دکھن ہر طرف دور دور تک پھیل رہی ہے۔ اس میں ہنومان جی کی نسل، وھیل اور ہاتھی کی نسل اور پرلوک کی آشا پر چلنے والے سبھی شامل ہیں۔ اور اب میں یہاں سے بھاگ جاتا ہوں کیونکہ یہاں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اب کالی کا اشنان ختم ہونے تک میں نہ آؤں گا، اور اس کے بعد کی کہانی اس پستک میں ہو گی جو میں رام چندر جی کے ٹوٹے ہوئے پل کے نیچے چھپا کر رکھ دوں گا۔ اب میں جنگلوں میں چھپنے جا رہا ہوں جہاں کے گھنے درخت میرا آخری سہارا ہیں ..... پنڈت نے پستک بند کر دی اور انھیں لے کر ونکٹ اور سوندھی سے کچھ کہے بغیر تہہ خانے کی طرف بھاگا جیسے اس کے دل میں کوئی ان دیکھا خوف سما گیا ہو۔

○

فرد کو کائنات کے بارے میں معلومات ان بنیادیات کے ذریعہ ہوتی ہے جو اسکے حواس اُسے مہیا کرتے ہیں لیکن جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے اس کا انحصار ماضی کے تجربات پر بھی ہوتا ہے اور اس کی حالیہ ضرورتوں اور خواہشوں پر بھی۔ اسی لئے نفسیات کے موضوع میں مشاہدہ تکلوری اور باہمی ارتباط دونوں عناصر پر مبنی ہوتا ہے لہذا مشاہدہ صرف حواس کے تاثر پر منحصر نہیں بلکہ دوسرے عنصر پر بھی۔ اس میں حواس کی معلومات کو منتخب معنی دے دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً ہم اشارے اور تصویریں دیکھتے ہیں، روشنی کے مختلف عناصر نہیں دیکھتے۔ ہم گانے کے الفاظ سنتے ہیں۔ خالص سُر کو نہیں سنتے۔ ہم اشکال دیکھتے ہیں جزئیات نہیں۔ بصیرت اور سماعت ادراک کی تجربے کی پیچیدہ اشکال ہیں ----

مشاہدے اور ادراک کے مطالعہ کے دوران ماہرین نفسیات نے وہم یا التباس کی جانب رجوع کیا۔ وہم میں ادراک یا مشاہدہ مختلف ہوتا ہے۔

"ابتدائی نفسیات"
ارنسٹ ہلگارڈ
ریچرڈ اٹکنسن اسٹینفورڈ یونیورسٹی
امریکہ

# آنکھیں

اس نے گھر اتنی جلدی جلدی بدلے تھے کہ اب گھر کا مالک ہوتے ہوئے بھی بے گھر تھا۔ اس لئے کہ گھر کے ساتھ ساتھ اس کے نام بھی بدلتے رہتے تھے اور اب اس کا کوئی نام نہ تھا۔ ایک دن خود ہی کہنے لگا۔

"نام اور گھر کا چولی دامن کا ساتھ ہے"

میں نے کہا" تو نام بھی ہے اور گھر بھی"

" مگر نام بھی پرایا۔ گھر بھی۔

اور پھر اس نے بتایا تھا کہ گارے اور مٹی کے گھروں میں رہنے والے بھٹکٹیا کا پھول کھا کر آنکھوں کی روشنی تیز کرتے ہیں۔ اینٹوں اور پتھروں کے باسی گلاب کا عرق ڈال کر آنکھوں میں چمک پیدا کرتے ہیں اور بھگوان کی آنکھیں تو شیشے کی ہوتی ہیں اور اسے امونیا سے صاف کرتے ہیں۔

" تم جانتے ہو کیوں ؟" اس نے بات کرتے کرتے پوچھا۔

میں نے لاعلمی ظاہر کی تو اس نے کہا" اس لئے کہ امونیا قدیم مصر کے دیوتا آمون کے مندر کے پاس بنتا تھا۔ تمہیں بتاؤں آمون کی آنکھوں کے بارے میں"

میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ میں اس کی بے سر پیر والی گفتگو سننے کا عادی ہو گیا تھا اور اسی طرح اسے کچھ آگے کہنے سے روکنے کا بھی۔ ویسے مجھے اسے روکنے میں اکثر کامیابی نہیں ہوتی تھی، اور آنکھوں کا ذکر آتے ہی مجھے اپنے مندر کی

دیوی یاد آنے لگی تھی۔ ہم کبھی کبھی دیوی کے درشن کو جایا کرتے تھے۔ امونیا اور آمون کی طرف سے اس کا دھیان ہٹانے کے لئے میں نے اس سے کہا۔

"چلو مندر چلتے ہیں۔"

"مندر؟"

"ہاں ہاں مندر"

"تم اسے مندر کہتے ہو۔ بڑے روایتی آدمی ہو۔ اُسے آرٹ گھر کہو۔"

"اچھا چلو۔ وہی سہی"

میں نے اس سے بحث کرنی مناسب نہ سمجھی۔ وہ ہر چیز کو ایک نیا نام دیتا تھا۔ مندر کے خوب صورت اور دیدہ زیب مجسّموں کو آرٹ کہتا تھا، اور ان مجسّموں کو اس نے خالص اور نخالص میں تقسیم کر رکھا تھا، اور اس کی تشریح بھی کرتا تھا۔

"جانتے ہو خالص کیا ہے؟ وہ جس میں خلوص ہو سچائی ہو اور وہ سچّائی جانتے ہو کیا ہے۔ جس میں ملاوٹ نہ ہو۔ UNADULTRATED۔"

"تمہیں پتہ کیسے چلتا ہے۔ اوپر سے تو سب مجسّمے ایک جیسے ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ شاید کوئی بدیہہ ہے، انترادانی بس اندر کا میٹیریل نظر آجاتا ہے۔"

"پھر تو میں بھی تمہیں اندر سے دکھائی دیتا ہوں گا۔"

"نہیں، میری نگاہیں کروموزوم کے جال کو پار نہیں کرسکتیں۔"

میں خاموش ہوگیا۔ اس لئے نہیں کہ میری سمجھ میں سب کچھ آگیا بلکہ اس لئے کہ اس کی بے دلیل باتیں سُن کر مجھے اس پر رحم آتا تھا۔ خدا معلوم کیوں مجھے اس کا ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں میرا ہم سفر پاگل نہ ہو جائے۔ مجھے خاموش دیکھ کر اُس نے کہا۔

"تم جانتے ہو آرٹسٹ کون ہے؟"

"ہاں" میں نے اس سوال کو نہایت آسان سمجھ کر اعتماد سے جواب دیا۔ "جو آرٹ کی تخلیق کرتا ہے۔"

"نہیں آرٹسٹ ہے شنکر اور ہنومان کے بیچ کا آدمی مجلول۔ IMMANENT"

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ پھر بہکنے لگا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر مندر کا رُخ کیا۔

دو تین قدم چلنے کے بعد وہ پھر ایسے بولا جیسے اس کے خیالوں کا سلسلہ منقطع نہ ہوا ہو۔

"اور آرٹسٹ ہمیشہ اپنے آرٹ کو تخلیق کر کے بے سہارا چھوڑ دیتا ہے۔ لوگ اجنتا کھودتے ہیں۔ پٹرا کھودتے ہیں۔ اہرام ڈھاتے ہیں، اور پھر موم اور مٹّی کے تازہ اور باسی بتوں کو کیمیائی مادّوں کی دھونی دیتے ہیں۔ ان کے بدن میں ریڈیائی لہروں کو دوڑاتے ہیں اور ان کے حصّوں کو لیزر بیم سے تتر بتر بھی کر دیتے ہیں اور ایک دن نہ آرٹ ہوگا نہ آرٹ گھر۔ صرف گنٹر ہوگا اور کاکروچ۔ ان دونوں کو بھگوان بھی تباہ نہیں کر سکتا شاید۔"

مندر دو تین قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہ خاموش ہو گیا تھا لیکن کچھ دیر کے بعد اس نے پھر ایک احمقانہ سوال کیا۔

"تم نے آئینہ دیکھا ہے؟"

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے اُسے غور سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہوں "کیا بیوقوفی کا سوال ہے" اس نے دوسرا سوال کیا۔

"کیا نظر آتا ہے؟"

"میں"

"میں تو وہ ہے۔ آئینے کے پیچھے والا"

"وہ پرچھائیں"

"نہیں وہ اصلی۔ تم یعنی تمہارا میں پرچھائیں!"

مندر آگیا تھا۔ زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ مجھے اس کے الٹے سیدھے سوالوں کا جواب نہ دینا پڑے گا۔ ہم نے جوتے باہر اتارے اور گرد اور گندگی سے اٹے ہوئے پیروں کو مندر کے در کے اندر رکھا۔ سامنے دیوی کی مورت تھی۔ بہار کے رنگ میں

سجی ہوئی۔ ہونٹ کورل چٹانوں کے عمق سے نکلے ہوئے۔ آنکھیں دن کی سورج مکھی۔
اور رات کی جوالامکھی۔ ہم دونوں اس کی میگنیٹک فیلڈ میں آ گئے . . . ٹر . . . ٹر
ررررر میں نے گھبرا کر اپنی گھڑی دیکھی۔ اس کی سوئی تیزی سے اینٹی کلاک وائز
گھوم رہی تھی اور پھر بالکل رک گئی۔ اس نے دیوی کی اور دیکھا اور پھر اپنی گھڑی
کی طرف اور بولا۔

"میں بہت پیچھے چلا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ۔ میرے اندر کروموزوم
گارڈ بدل رہے ہیں اور میں زمین سے اٹھ رہا ہوں۔ شاید
اس دیوی کی آنکھوں کی کشش زمین کی کشش سے زیادہ ہے۔"

"اچھا تو اب ایسا کرو۔ دیوی کی آنکھوں کو چومو۔ پھر ہونٹوں کو
اور پھر اس کے چرن چھو کر مانگ لو جو مانگنا ہے۔"

وہ اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہا اور آگے نہ بڑھا۔ میں نے کہا۔

"کیا سوچ رہے ہو۔ شاید یہ کہ یہ مجسمہ کس آرٹسٹ کا ہے؟"

"نہیں۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ تخلیق کس کی ہے۔ مجھے آرٹ سے محبت ہے۔
آرٹسٹ کوئی بھی ہو۔"

"تو پھر جاتے کیوں نہیں اس کے قریب"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں پہلے دیوی سے اچھا مانگوں۔ پھر اس کی آنکھوں کو
چوموں۔ پھر اس کے ہونٹوں کو، پھر اس کے چرن چھوؤں۔"

"مگر یہ تو بھگوان کا پروسیجر نہیں ہے"

"تو میں اس پروسیجر کو الٹ دیتا ہوں۔ کیا دیوی پہل نہیں کر سکتی۔"

میں نے سوچا کہ پھر اس کا دماغ چل گیا ہے۔ اس سے بحث فضول ہے۔ چلو اس
کے جیسی کرنے دیں۔

"کیا مانگا تم نے؟"

"یہی کہ دیوی پہلے آگے بڑھے۔ اپنی خوب صورت آنکھوں سے میری اور دیکھے۔

ان آنکھوں میں پیار رہو۔ پھر میں اس کی آنکھوں کو چوموں۔ پھر دیوی اپنے لبوں کو جنبش دے، اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے کہے۔ انھیں بھی چومو، پھر وہ اپنے انگ میرے قریب لائے اور خود میرا سر اپنے قدموں پر جھکا دے۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ لیکن وہ بالکل سنجیدہ تھا۔ وہ صرف دیوی کی غیر متحرک آنکھوں کو دیکھ رہا تھا جو شاید شیشے کی بنی ہوئی تھیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم بالکل پاگل ہو۔ دیوی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتی۔ یہ ایک جامد حسن ہے جسے متحرک اجسام پیار کرتے ہیں اور شاید دیوی بھی ان سے پیار کرتی ہے۔ لیکن یہ اپنا استھان نہیں چھوڑ سکتی۔ دیکھتے نہیں ہو اس کی کمر سے نیچے سب کچھ پتھروں میں پیوست ہے۔ دوسرے پجاری تو دیوی سے حرکت کرنے کو نہیں کہتے۔"

"میں نے تو مانگ لیا جو مانگنا تھا۔ اگر دیوی کی میگنیٹک فیلڈ ہے تو میری بھی ایک فیلڈ ہے۔ ویسے اس کی بنیاد میتھمیٹکس پر نہیں ہے۔ میں آئنسٹائن نہیں ہوں۔ آدمی ہوں اور مجھے الہام ہوتا ہے۔"

اور پھر اس نے دوسرے پجاریوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیوں بھائیو بہنو۔ یہاں جوالا مکھی ہے۔"

سب پجاری بھی اس عجیب و غریب سوال پر ہنس دیے۔ آخر ایک منچلے نے کہا۔

"پہلے تھا ساؤنٹ اٹنا واشنگٹن چلا گیا۔ اس کے بدلے ایر کنڈیشنر ہے اوپر لگا ہوا۔"

وہ میری طرف مخاطب ہوا۔

"سنا تم نے۔ جمی ہوئی آنکھوں کو کیا چومنا۔ اس میں جوالا مکھی کی جوت کہاں ہے۔ سچ کی گرمی نہیں۔ جھوٹ کی ٹھنڈک ہے۔ اوپر چھوکرے ہیں۔"

تھوڑی دیر رک کر وہ زور سے بولا۔

"بنا دو اسے ایفروڈائٹ سے وینس۔ چھین لو اس کے دوسرے ہاتھ

کی مالا؟"

"مگر پرارتھنا"

"میں بغیر اچھا پوری ہوئے پرارتھنا نہیں کرتا۔ وہ خوشامد ہوتی ہے۔ اچھا پوری ہونے کے بعد دھنواد"۔

"مگر لوگ؟" میں نے ایک اور کوشش کی۔

"میں لوگ نہیں۔ میرا نام ہے۔ اوں۔ اوں۔ اوں۔ کیسا ہے میرا نام؟"

وہ خاموش ہوگیا اور تین سو ساٹھ ڈگری کا زاویہ بنایا۔

میں نے سوچا مجھے اپنا سوبھاؤ رکھنا چاہیے۔ مگر کون سا سوبھاؤ۔ دیوی کی طرف بڑھنے والا یا آدمی کی طرف جو ابھی مندر سے نکلا ہے۔

میں نے دیوی کی اُور دیکھا۔ پھر دروازے کی اُور۔ پھر میں مندر سے نکل گیا۔

وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ صرف ایک آواز ہوا میں وائبریٹ کر رہی تھی جیسے کوئی ہزاروں سال پہلے کا سوال اب بھی جواب طلب ہو۔

"دیویاں پیار کروانا ہی جانتی ہیں یا پیار کرنا بھی"

میں نے پھر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ نہیں تھا۔ صرف میں تھا، اور میرے ہونٹ ہل رہے تھے . . . . کھٹ۔ کہیں سے ہلکی سی آواز آئی۔ شاید وی سی آر پر ٹیپ ریوائنڈ ہو چکی تھی۔ یا ہوا سے کھڑکی کھل گئی تھی۔

# لچّھن

دن تاریخ تو اسے یاد نہیں تھے۔ ویسے بھی وہ کبھی دن تاریخ کی بات نہیں کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نہ کوئی دن ہوتا ہے اور نہ کوئی زمانہ۔ یہ تو بس بتائی ہوئی باتیں ہیں تاکہ تجارتی لین دین ہو سکے۔ زندگی اور زمانہ تو مسلسل ہے اور ان کا تعین بھی غلط ہوتا ہے۔ کسی گزرے ہوئے واقعے کی بات کرو تو بات کے دوران وہ وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ حال کی بات کرو تو بات کرنے کے ساتھ ہی حال ماضی ہو چکا ہوتا ہے اور مستقبل کا تعین تو یوں بھی امکانی ہوتا ہے یقینی نہیں۔ لہٰذا کب اور کہاں کا تعین کیے بغیر وہ اپنے مخاطب کو بتا رہا تھا کہ جو بچّہ پیدا ہوا تھا اس کے دائیں ہاتھ پر سرخ نشان تھا۔

کس جگہ پر؟

پوری ہتھیلی پر اور انگلیوں کی پوروں پر۔

ایسا کیوں ہے؟

مجھے کچھ نہیں معلوم۔ لیکن لوگ کہنے لگے کہ یہ لچھّن بدن کے کسی بھی حصّے پر ہو سکتا ہے۔ پھر ایک نے دوسرے کے کان میں چپکے سے کچھ کہا۔

دوسرے نے زور سے پوچھا۔

اس کے خاندان میں یعنی تمہارے دادا، پردادا وغیرہ، پیڑھی میں!

باپ نے نفی میں سر ہلایا اور بچّے کے ہاتھ کے لچھّن دیکھنے لگا۔

پہلے یہ اخبار کی ہیڈلائن بنی اور کچھ دنوں کے بعد معمول بن گئی۔ اب اس کی کوئی اشتہاری قیمت نہیں تھی کیوں کہ ہر دوسرا بچہ ہاتھ میں گچھن لے کر پیدا ہوتا تھا اور جس بچّے کے ہاتھ پر گچھّن نہیں تھا اسے لوگ غیر معمولی سمجھتے تھے۔

تمہارا ہاتھ لال کیوں ہے؟

لال نہیں ہے۔ یہ گچھّن ہے۔

نہیں، تم نے رنگ لگا رکھا ہے۔

لو گھس کر دیکھ لو۔

اور رنگ ہوتا تو صاف ہو جاتا۔ وہ کہنے لگا۔

دیکھا تم نے، یہ بہادری اور ہمّت کی نشانی ہے۔ تم گھر گھُسے خاندان سے معلوم ہوتے ہو۔ بزدل۔

اس کے ماتھے پر شکن آئی۔ اس نے اپنے مخاطب لڑکے سے کہا۔ بُزدل کہتے ہو۔ پنجہ لڑا کر دیکھ لو۔

وہ زور سے ہنسا۔

پنجہ اور گھونسا اور لاٹھی۔ تم کتنے پرانے زمانے کی بات کر رہے ہو۔ اسی لیے تو کہا تھا کہ گھر گھُسے خاندان کے لگتے ہو۔ اُسے غصّہ آیا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا اظہار کس طرح کرے پھر رونا آیا۔ گھر جا کر اپنے باپ سے اس نے پہلے یہی سوال کیا۔

گھر گھسنا کسے کہتے ہیں۔

بُزدل کو۔

"تو کیا ہم لوگ بُزدل ہیں؟" اس کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ غصّہ اور ندامت سے بھری ہوئی۔

"تمہیں، تمہارے پردادا نے ..... تمہارے دادا نے ..... میں نے ..... غرض کہ سب نے جنگجویانہ زندگی گزاری۔"

"تو وہ ہمیں بُزدل کیوں کہتا ہے؟"

"کون ؟"

"وہی . . . ."

باپ خاموش ہوگیا اور چند سیکنڈ تک خاموش رہا۔

"کیا اس کے ہاتھ پر گچھّن . . . . کیا اس کے دائیں ہاتھ پر لال رنگ کا نشان ہے ؟"

"جی . . . ."

"اوہ ! میں تمہیں یہ بتانا بھول گیا کہ پچھلے کئی سالوں سے یعنی تمہاری پیدائش سے پہلے سے گھر گھسنے کے معنی بدل گئے تھے۔ گھر گھسنا امن پسندی کو کہتے تھے۔"

"تو کیا وہ بزدل تھے ؟"

"نہیں، اپنوں سے بیر نہیں رکھتے تھے۔ ہاتھ لاؤ۔"

اور اس نے اس کے ہاتھ کو غور سے دیکھا۔

"نہیں۔ کچھ نہیں۔ اور ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ ہمارے یہاں تو کسی نے . . . . ."

بیٹے نے سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا مگر وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"ناشتہ کر لیا تم نے ؟"

بیٹے نے ہاں کہہ دیا، مگر سوچتا رہا کہ بہادری اور بزدلی کے درمیان یہ ناشتہ کہاں سے آگیا ؟

اور جب شام کے وقت سب جمع ہوتے تو افق پر پھیلی ہوئی سرخی کو دیکھ کر سارے گچھّن والے اپنے ہاتھوں کو ملا کر زمین پر افق بناتے اور سورج کے ساتھ ہزاروں کرنوں کے ڈوبنے کا تماشہ دیکھتے اور پھر دوسرے لڑکوں سے جو اپنے ہاتھوں کو ملا کر صرف زمین کا مٹیالا رنگ ایمیٹیٹ کر سکتے کہتے "گھر گھُسنے" شلٹر طلب کتنے بدصورت ہو تم لوگ ! تم صرف مٹی کا رنگ ایمیٹیٹ کر سکتے ہو۔ لیکن آسمان پر پھیلی ہوئی سرخی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

"لیکن آسمان کی سرخی سورج کے ڈوبنے کا شاخسانہ ہے، اور اس کے بعد روشنی

غائب ہو جاتی ہے۔ اندھیرا ہی اندھیرا۔"

"تو پھر زمین پر کون سی روشنی ہوتی ہے۔ یہاں تو ہر وقت مردنی چھائی رہتی ہے اور تم لوگ اس میں رینگتے رہتے ہو۔"

اس کو پھر فاورفنگر کی ضرورت ہوئی۔ اس نے قد آور درختوں کو دیکھا، پھر چڑیا گھر کے قوی ہیکل ہاتھیوں کو دیکھا۔ پھر کالے اور براؤن ناگ کو ان کے پھن کے پورے پھیلاؤ کے ساتھ دیکھا۔ پھر سورج کو ساری زمین پر کرنیں بکھیرتے دیکھا اور پھر اسے ڈوبتے دیکھا اور اندھیرے چاند اور ستاروں پر بھروسہ بے کار تھا۔ کبھی آدھا، کبھی پورا، کبھی بنتا، کبھی ٹوٹتا۔ ویسے آسمان کے پار دیکھنا بھی بے کار تھا کیوں کہ حدِ نگاہ مانع آتی تھی اور آواز فضا میں تحلیل ہو جاتی تھی، اور اس نے سوچا بصیرت کے پیچھے بھاگنا لاحاصل ہے اور بصارت ہی کا سہارا لینا چاہیے۔ وہ گھر کی طرف گیا اور اپنے باپ سے پوچھا۔

"یہ جو ہیں نا، لچھّن والے فرسٹ کلاس شہری، یہ ہمیں کیڑا کہتے ہیں۔"

"کیڑے تو سبھی ہوتے ہیں۔ بس سورج کی روشنی کسی کسی کو عمودی بنا دیتی ہے۔"

"سب کو کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ سورج کی کرنیں سب پر یکساں نہیں پڑتیں۔ کسی پر سیدھی اور کسی پر ترچھی۔"

"اور مساوات اور کامن باپ اور کامن فلاں اور کامن فلاں ...."

"کچھ بھی کامن نہیں۔ مساوات صرف معصومیت اور HELPLESSNESS کا کام ہے۔ شاید پیٹ یا پالنے میں یا قبر میں ..... نہیں نہیں صرف قبر میں .... نہیں وہ تو کلیتے ہے۔ گاربیج کے ڈمپ پر، جھاڑیوں کے پیچھے، اسپتال کے مردہ خانے میں یا بند مکان میں۔

"اور پیٹ پالنے اور قبر اور مردہ خانے وغیرہ وغیرہ کے درمیان؟"

"نعرے، تقریریں، وعظ، ٹی وی، ریڈیو، مسجد، گرجا، سینیگوگ اور شوالے۔"

"سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے :: تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے"

"مسجد تو بنا لی شب بھر میں ...."

"شٹ اپ، جاؤ باہر اور بھائیوں کے ساتھ کھیلو۔"

"کون سے بھائی؟ وہ تو ہمیں چکن اور گٹری کہتے ہیں۔"

"کہنے دو۔ پھر بھی وہ تمہارے بھائی ہیں۔"

"تو پھر ہم بھی ہتھیلیوں پر مہندی لگا لیتے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ مہندی جنم رنگ نہیں بنتی۔ اس کے لئے رسک لینا پڑتا ہے، پیسے کا، پردیس کا، پولیس کا۔"

"کوئی اور راستہ نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں۔ یا سچے سائیں یا جھوٹے علامی۔"

"وہ کیا؟"

"تم نہیں سمجھو گے۔ ابھی نابالغ ہو۔ جاؤ بھائیوں کے ساتھ کھیلو۔"

"اور اگر وہ؟"

"سمجھ گیا تو پھر گانے گانا۔ ہم ایک ہیں۔ ہم ایک ہیں۔"

اور وہ ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

"بھائی کہاں جا رہے ہو؟"

اس کے مخاطب نے حقارت سے دیکھا، لیکن سنبھل کر بولا "کیوں بھائی تم بھی چلو گے۔"

"ہاں۔"

"تو چلو نا، پیچھے پیچھے آجاؤ"

اور اس نے ریگستان پار کیا اور دریا پار کیا اور پہاڑیاں پار کیں اور ایسی جگہ پہنچا جہاں اجنبی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں اور لوگ اس کی زبان نہ سمجھتے تھے۔ وہ اس کے بالکل قریب چلا گیا اور سہمے سہمے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ اس

کے آگے والے کی رفتار سست ہو گئی تھی ۔ وہ چلتے وقت اوپر دیکھتا تھا اور پھر چاروں طرف دیکھتا تھا ۔ اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا ۔

"کیا دیکھ رہے ہو بھائی؟"

"کوئی جواب نہیں"۔

اس نے پھر پوچھا "یہ اوپر کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کوّا، اور نیچے گار بیج"۔

"کوّا بتائے گا کہ گاربیج کس جگہ ہے اور اس میں کس طرح ڈمپ کیا جاتا ہے"۔

یہ کہہ کر اس نے اپنا دایاں ہاتھ اور انگلی ٹریگر سے ہٹایا۔

اس نے دیکھا کہ بھائی کے ہاتھ پر مجھّن تھا۔ پہلی نسلوں کی خونی وراثت کا جنم رنگ۔

O

# آرٹسٹ کی دوسری کوشش

اس نے سوچا کہ وہ ان تمام غلطیوں کا ازالہ کرے گا جو اس نے اپنی پہلی زندگی میں کی تھیں، اور پھر اس نے اپنی آنکھیں موند لیں اور تمام غلطیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اگر یوں کیا ہوتا تو یہ ہوتا۔ اگر یوں نہ کیا ہوتا تو یوں ہوتا۔ لیکن ابھی تک وہ اپنی غلطیوں کا تعین، تاریخ اور مقام کے مطابق نہیں کر سکا تھا۔ بہت سے واقعات جنھیں وہ اپنی غلطیوں اور ان کے نتائج سے تعبیر کرتا تھا آپس میں اس طرح مدغم ہو گئے تھے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا یا پہلے اور بعد کی نشان دہی کرنی صرف شاید کی حد تک ممکن تھا۔ البتہ اس کے قد کا سہارا کارآمد ثابت ہوا اور پھر اس نے وہاں سے شروع کیا جہاں اسے تالاب میں صرف اپنی ہی صورت نظر آتی تھی اور کوئیں میں پھینکے ہوئے پتھر کی آواز دنیا میں سب سے خوب صورت آواز تھی اور پھر وہ سوچنے لگا "میرے جیسا کون ہے؟ ساری دنیا میرے لئے ہے"۔ بہت سی ملی جلی آوازیں ایک ساتھ آنے لگیں۔ مٹی کے ٹھیکروں سے لے کر بجلی کے سل تک کی آوازیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کو بہت سی بھیڑ بکریاں نظر آئیں جو چہار دیواری کے اندر دوڑ رہی تھیں۔ مگر باہر نہیں جا سکتی تھیں، اور اس کے کانوں میں بار بار آوازیں آتی رہیں۔

"دیکھو باہر نہ نکلنے پائیں"

"دروازہ مضبوطی سے بند ہے نا؟"

"چاروں طرف گیدڑ پھر رہے ہیں"

"اور اغوا کرنے والے آدمی بھی"

"کہیں زہریلی گھاس نہ کھالیں"

"کسی چیز سے ٹکرا کر اپنے کو زخمی نہ کرلیں"

"سردی نہ لگ جائے"

"انھیں اچھے بُرے کی تمیز کہاں"

اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بھی بھیڑوں بکریوں کے درمیان کھڑا ہے اور جو ہدایات بھیڑ بکریوں کے لئے تھیں وہی اس کے لئے بھی تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ اس جبر کے خلاف احتجاج کرے مگر احتجاج کے لیے جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ اُسے نہ آتے تھے۔ جبر کا احساس شدید ہوگیا۔ وہ چہار دیواری کے دروازے کی جانب بھاگا اور اسے بند دیکھ کر دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ بھیڑیں بھی اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھیں اور جب دروازہ کھلا تو یہ بھی کسی نہ کسی کی پناہ میں تھا۔ لاپناہی کے شوق اور بیچارگی کے احساس نے اسے جھنجھوڑنا شروع کیا۔ اور اس نے آنکھیں کھول دیں لیکن فوراً ہی بند کرلیں کیوں کہ سامنے دیوار پر لگی ہوئی سفیدی اور جھرّیوں والی تصویر اُسے بہت بری لگی۔ اس نے کئی جملے ادا کئے۔ کچھ زبان پر آئے اور کچھ نہیں۔

"یہاں تو دو ہی چیزیں ہیں۔ جبر یا عصمت۔ دونوں خود مختار۔ آگے چلو"

اور آگے چلنے کے لئے تین سو ساٹھ ڈگری کا زاویہ بنانا پڑا کیوں کہ وہ جس سمت میں دیکھ رہا تھا اس کے آگے گہری کھائی تھی جس میں چٹانوں پر اُگے ہوئے بانس سے شبنم کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کے سارے جسم میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اُس نے انگڑائی لی اور اس کا جی چاہا کہ شبنم کے قطروں کو پیالے میں جمع کرلے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور سوچنے لگا۔ لوگ مجھے دیکھ کیوں رہے ہیں۔ کیا یہ میرے ارادوں کو سمجھ گئے ہیں، مگر میں بھی اب انھیں کی طرح ہوں۔ کیا مجھے حق نہیں کہ میں جو چاہوں کروں اور پھر وہ چاروں طرف پھیلے ہوئے گیہوں کے کھیتوں کو دیکھنے لگا اور پھر درختوں

میں لگے ہوئے سیب کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور ان کی طرف بڑھا، پیچھے سے کئی آوازیں آئیں۔ کچھ مردانی، کچھ زنانی آوازیں۔

"ٹھہرو۔ تم من مانی نہیں کر سکتے۔"

"تمہیں روایت کا پاس نہیں۔"

"تم دین اور مذہب کے بتائے ہوئے اصولوں کے ماتحت ہو۔"

"کیا تم نے اسی کرتوت کے لیے شخصیت کا لبادہ اوڑھا ہے؟"

"تم اب جانور تو نہیں ہو۔ انسان ہو۔"

"لوگ کیا کہیں گے؟"

اور اسے ایسا لگا جیسے بھیڑ بکریوں کے مویشی خانے سے نکل کر بھی وہ آزاد نہیں ہے، اور پھر اسے چاروں طرف زنجیریں دکھائی دینے لگیں جو اس کے ہاتھ اور پیر کو حرکت کرنے سے روک رہی تھیں۔ اس نے سوچا۔

"یہی تو پہلے بھی ہوا تھا، مگر میں نے یہی چاہا تھا کہ اس زندگی میں وہ نہ کروں گا جو پہلے کرتا تھا"

اُس نے زور کا جھٹکا دیا۔ قریب کی زنجیروں کو توڑ دیا اور بھاگنے لگا یہاں تک کہ اب اسے زنانی اور مردانی آوازیں نہیں سنائی دیتی تھیں۔ اب وہ ایک کھلے میدان میں کھڑا تھا۔ سورج کی تپش سے بچنے کے لئے اس نے ایک درخت کا سہارا لیا۔ لیکن اسے فوراً ہی احساس ہوا کہ درخت خود خزاں زدہ ہے۔ اس کی پتّیاں جھڑ رہی تھیں اور وہ زیادہ دیر اس کی پناہ گاہ نہیں بن سکتا تھا اس نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا اور سوچنے لگا۔

"ان زنجیروں کے پیچھے جو دیواروں سے گھرا ہوا صحن تھا اس کے پاس دالان میں تو سارا انتظام تھا، کھانے کا، سونے کا، بارش اور ہوا سے بچنے کا۔ لیکن زنجیریں!"

اور زنجیروں کا خیال آتے ہی وہ اپنے آپ بڑبڑانے لگا۔ "نہیں۔ یہی تو میں نے چاہا تھا

اب وہ نہ ہوگا جو پہلے ہوا تھا۔ اس جنم میں زنجیروں کے سہارے نہیں رہ سکتا۔ لیکن زندہ رہنا بھی ضروری تھا۔ اپنے مادی جسم میں میٹابولزم کے عمل کو جاری رکھنے کے لیے۔ یہ تو ایک فطری جبر ہے جس سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ اس نے بڑی دیر تک غور کیا۔ کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی۔ اب اس پر بھوک اور نیند دونوں کا غلبہ تھا۔ آخر اس کا حوصلہ پست ہونے لگا۔ اس نے سوچا۔ چلو وہی کرتے ہیں جو پہلے کیا تھا۔ یہاں بھی وہ نہ کر سکا جو کرنا چاہتا تھا، اور پھر وہی کر رہا ہوں جو پہلے کیا تھا۔ اُسے مجبوری کا شدید احساس ہوا۔ لیکن اس نے پھر اپنے ارادے کو تقویت دی۔

"کوئی بات نہیں۔ ان دو منزلوں پر تو میری قوتِ ارادی جبر کے تحت ہو گئی۔ آگے دیکھتا ہوں۔" اور اس غیر شعوری چیلنج نے اس کے اعصاب میں کھچاؤ پیدا کر دیا۔ اس کی آنکھ کھل گئی اور اس کی نظر اس پنشن بک پر پڑی جو میز پر احتیاط سے رکھی ہوئی تھی، اور وہ تمام تصویریں جو دیوار پر لگی تھیں اس کا منہ چڑانے لگیں۔ پگڈنڈیوں اور ان پر چلنے والی بیل گاڑی کی تصویر، پکی سڑک اور اس پر چلنے والی سائیکل کی تصویر۔ ہائی وے اور اس پر بھاگتی ہوئی تیز کاروں کی تصویر۔ اس نے سوچا راستے اور چلنے کے ذرائع تو یہی ہیں۔ کیا بغیر ان راہوں پر چلے کچھ نہیں ہو سکتا۔ سوچا تو یہی تھا کہ اس پر نہ چلوں گا۔ لیکن میں فضا میں پرواز تو نہیں کر سکتا۔ اور یہ سوچتے ہی اُسے اپنے نازک بازوؤں کا خیال آیا۔ آئیکیرس کی مہم جوئی اور سورج کی دشمنی اور ڈیڈیلس کی بھول بھلیاں کا خیال آیا۔ اس کے بعد اس نے انھیں راہوں پر دھیرے دھیرے کھسکنے میں اپنی عافیت دیکھی۔ "لیکن پہلے اور دوسرے جنم میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔" اُس نے سوچا "پہلے تجربے کس کام کے اگر ان سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔" وہ پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر پکی سڑک پر چلنے لگا، لیکن اس کے جوتے کے تلے جواب دینے لگے اور ہائی وے پر چلتی ہوئی گاڑی پر چلنے کے لیے بیتاب ہو گیا۔ اسے پھر جبر کا احساس ہونے لگا، دائمی حرکت کے جبر کا۔ اس کی میز پر پڑی ہوئی پنشن بک اسے منزل کا مکروہ چہرہ دکھانے لگی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ایسا لگا کہ اپنے تمام جسم کے اعضا کو سکوڑ کر اس نے ہائی جمپ کیا اور

پھر زور سے ہنسا اور بولا۔

"یہ ٹھیک ہے۔ کم سے کم میں نے ایک مقصد تو حاصل کر لیا بجائے نیچے سے شروع کرنے کے بلندیوں پر چلنا شروع کیا۔ مگر کتنی بلندی؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔"

ابھی وہ اپنے ماتحت کو ڈانٹ ڈپٹ کر فارغ ہوا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اس کی فیکٹری میں آگ لگ گئی تھی اور فائر بریگیڈ کا عملہ اسے بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرے دن وہ کرسی نشینوں کے سامنے اسی طرح کھڑا تھا جس طرح پہلے اس کا ماتحت اس کے سامنے گردن جھکائے کھڑا تھا۔

جملے گرامر کے لحاظ سے صحیح تھے۔ الفاظ رد وئے معلّٰی اور کنگس انگلش کے تھے مگر اُسے بندش کا احساس اسی طرح ہو رہا تھا جس طرح پہلے اس کے ماتحت کو ہوا تھا۔ مادّی رسل و رسائل کے منقطع ہونے کا احساس، بلندی سے نشیب میں ڈھکیل دیے جانے کا احساس، بلندی اور پستی کی تفاوت اور حد کا احساس اور پھر اس کی قوت ارادی جبر کے تابع ہو گئی اور اس نے زور سے چیخ کر کہا۔

"پھر دہرا رہا ہوں اسی کہانی کو جسے بھولنا چاہتا تھا۔"

لیکن دوسرے ہی لمحے اسے خیال آیا کہ ایک معاملے میں وہ پہلے سے بہتر ہے۔ اُسے صرف اپنی بے مائیگی کا احساس ہے مگر اپنے سے منسلک اوروں کی بے مائیگی کا نہیں۔

"یہ ضرور کروں گا۔" اس نے زور سے کہا۔ "اپنے سے کسی کو منسلک نہ کروں گا اور کروں گا بھی تو ان کی تعداد میں اضافہ نہ ہونے دوں گا۔"

قریب ہی شور و غل کی آواز نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔

"میں نے بڑی غلطی کی۔ مصیبت پال لی۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ میں ایک موالی کے ساتھ باندھی جا رہی ہوں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ اور بھی تو لوگ ہیں۔"

"یہ میری ذمّے داری نہیں۔ میں نے تو اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ تم نے مجھے کیا دیا؟"

"کاش کہ وہ ہوگیا ہوتا تو تم سے پالا نہ پڑتا"
"میں بھی کہاں گرا۔گرنے کے لیے تو اور جگہیں تھیں"
اور پھر کہیں سے ایک گمبھیر آواز
"لوگ کیا کہیں گے؟"
"دل اور مذہب کچھ بھی کہیں لوگ کیا کہیں گے۔
یہ تو جنم جنمان کا بندھن ہے۔
"نہیں، اس جنم کا نہیں" اس نے چیخ کر کہا۔

اور مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔وہ دو قدم آگے چلتا تھا تو بندھن اسے دو قدم پیچھے جانے پر مجبور کرتا تھا۔اس کی رفتار بہت سست ہوگئی۔ایک ہی سمت۔ ایک ہی راستے پر، اور اس نے سوچا کتنا ہی رنگین سہی، بندھن تو بندھن ہوتا ہے۔ اور اسے پھر جبر کا احساس ہوا، لیکن اس نے بلند آواز میں کہا۔
"اس کے نہ کرنے پر تو مجھے اختیار ہے، اور اب میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔
وہ نہ کروں گا جو پہلے کیا تھا۔"

تنہائی بہت اچھی لگی۔یہ تنہائی ہی تھی جس میں اسے سوچنے، سمجھنے، چلنے پھرنے کی آزادی تھی۔وہ وقت اور جگہ کی پابندی سے آزاد تھا۔کھانے کے اوقات خود مقرر کرتا تھا۔کپڑوں کا انتخاب خود کرتا تھا۔یہاں تک کہ کپڑے پہننے اور نہ پہننے کا بھی۔اگر وہ گانا گاتا تھا تو کوئی یہ کہنے والا نہیں تھا کہ اس میں تکنیکی طور پر کون سی خرابی ہے۔وہ بولتا تھا تو کوئی اس کی گرامر یا الفاظ کی صحت پر رائے دینے والا نہیں تھا۔کوئی اس سے میک اپ کی تعریف کرنے کے لیے نہیں کہتا تھا۔اس لیے وہ جھوٹ سے بھی آزاد تھا اور یہ سوچ کر وہ زور سے ہنسا اور بولا۔
"یہ عصمت جبر کے تابع نہیں میرے عمل کے تابع ہے"

گھڑی کے پنڈولم میں آدھی رات کے بعد دو گھنٹے گزرنے کی آواز آئی اور اسے سوتے میں ایسا لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہو "کب تک؟"

وہ صبح صبح گھر سے نکلا۔ تفریحاً نہیں بلکہ جبراً۔ اس لیے کہ وہ زندگی کے ہر جبر پر قابو پانے سے قاصر تھا۔ اس نے غور کیا، یہ زمانہ کم سے کم کا تھا۔ مینیمم ڈٹرینس (MINIMUM DETERENCE) مینیمم فورس (MINIMUM FORCE) مینیمم سبسیٹنس (SUBSISTENCE) اور نتیجتاً مینیمم لائف (MINIMUM LIFE) اور مینیمم اور میکسیمم (MINIMUM & MAXIMUM) میں فاصلہ بہت کم تھا۔ میکسیمم رزرو تھا مینیمم عام، اور وہ ایک عام آدمی تھا۔ اس نے سوچا اگر سب کچھ مینیمم ہے تو جبر بھی کم سے کم ہونا چاہیے۔ لیکن وہ LAISSES FAIRE کا قائل نہیں تھا۔ اس میں تو صرف ایک طرح کے جبر کو کم کر کے میکسیمم سکون کا راز پوشیدہ تھا، اور پھر یہ میکسیمم طرح طرح کے جبر کو جنم دیتا تھا۔ وہ تو ہر طرح کے جبر سے آزاد رہنا چاہتا تھا۔ وہ گلی کے موڑ سے سڑک کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ کئی آوازیں اس کے کانوں میں آئیں۔

"بیچارا"

"مگر کیوں؟"

"معلوم نہیں۔ ہوگی کوئی بات۔ آج کل کون جوان مرد اکیلا رہتا ہے"

تجرد کیوں؟

مجھے کیا معلوم؟

اُوں اُوں۔ قہقہہ

یار کچھ کرنا پڑے گا۔ یہاں سب فیملی والے رہتے ہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔

ابھی وہ دفتر پہنچا ہی تھا کہ طلبی ہوگئی۔ اس کا باس کہہ رہا تھا۔

سنا ہے تم اکیلے رہتے ہو۔

جی

کیوں؟

جناب یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔

اس کا باس کچھ دیر خاموش رہا۔

"دیکھو میرے دوست ہیں۔ ڈاکٹر جی فردوش، ماہر نفسیات وجنسیات انھیں چٹھی لکھ دیتا ہوں۔ مل لو ان سے۔"

"جی وہ بات نہیں"

"پھر"

"جی بس میرے اصول"

"ارے بھائی۔ اصول وصول کچھ نہیں ہوتے۔ تم جنگل میں تو رہتے نہیں۔ لوگ کیا کہتے ہیں۔ بس یہی کاؤنٹ کرتا ہے۔"

باہر نکلا تو غم اور غصے کی ملی جلی کیفیت سے دوچار تھا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا مگر کوئی دوسرا اس کی آواز نہ سن سکتا تھا حالانکہ اس کے چاروں طرف ہجوم تھا۔

"یہ بھی کوئی بات ہے۔ کیا میں دوسروں کی زندگی جیتا ہوں۔"

"مجھے اپنی زندگی گذارنے کا حق نہیں"

"میں کسی کو کوئی تکلیف نہیں دیتا لیکن ہر شخص کو مجھ سے شکایت ہے۔ میں غیر منسلک رہنا چاہتا ہوں لیکن دوسرے مجھ سے خواہ مخواہ منسلک ہو جاتے ہیں۔"

"کیا زندگی صرف رشتوں کا نام ہے؟"

اور پھر اسے محسوس ہوا کہ بہت سے ہاتھ اس کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ بھانت بھانت کے انجانے اور خوفناک چہرے اُسے ڈرا رہے تھے۔ زنجیریں اور رسیاں لیے لوگ اس کی طرف بڑھ رہے تھے اور ہر طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ زندگی صرف بندھن سے رشتہ ہے، الحاق ہے، اور پھر لوگوں نے بڑھ کر اسے زنجیریں پہنا دیں، اور اسے جیل خانے کے صحن میں ڈال دیا۔ پہلے خوشبو پھیلی، پھر پودے اُگے، پھر پھول کھلے اور پھر اس کی شخصیت معدوم ہو گئی۔ اب وہ صرف پودوں اور پھولوں کے رشتوں سے جانا جاتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کو کوئی اور اٹھاتا تھا۔ اس کے پیروں کو کوئی اور چلاتا تھا وہ مفلوج تھا۔ شاید اس کی سانس اپنی تھی یا شاید وہ بھی نہیں۔

اس نے بستر پر تڑپنا شروع کیا۔کسی سامنم بولزم سے آزاد ہونے کے لیے کسی دوسری راہ کو اختیار کرنے کے لئے ۔ وہ نہ کرنے کے لئے جو اس نے پہلے کیا تھا ۔ مگر ساری کوششیں بیکار تھیں ۔ جبر اس کی ساری زندگی پر حادی ہو چکا تھا ، راستے کھو گئے تھے ۔ سفید بالوں والی پپڑی جمی ہوئی کھالوں والی تصویر پھر اس کے سامنے تھی اور وہ سوچ رہا تھا ۔ میں پھر جبر کا شکار ہو گیا ۔ میں نے پھر وہی کیا جو پہلے کیا تھا اور شاید پھر میرا جنم ہو تو وہی کروں گا جو پہلے کیا تھا ۔ میں خود راہوں پر نہیں چل سکتا ۔ میرا ارادہ مفقود ہے ۔ میں ایک روبٹ ہوں ۔

اور بہت سی جانی پہچانی شکلیں اس کے سامنے سے گزرنے لگیں ۔ سقراط کی، جوش ملیح آبادی کی ، فراق گورکھپوری کی ۔

O

بولے ہوئے الفاظ میں صوت ہی سب سے بڑا عنصر ہے
اسکے معنی سننے والے کے لئے وہی ہوں گے جو اس کے معاشرے
میں مستعمل ہیں۔ اگر لفظ ذو معنی ہے تو سننے والا وہی سُنے
گا جس کا تعلق اسکے قریب ترین خوشگوار یا ناخوشگوار
تجربہ سے ہوگا۔ "اوجھڑی" معدہ کو کہتے ہیں جو جانور کو ذبح
کرنے کے بعد عموماً پھینک دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ لفظ کچھ سننے
والوں کیلئے کسی المیہ کا تلازمہ بھی ہو سکتا ہے۔

# سُجُق

اسکول کا یونیفارم اب تک اس کے جسم پر تھا حالانکہ اسکولوں میں چھٹی ہوئے کتنے پہر گزر چکے تھے۔ وہ سہمی سہمی ایک چٹان کے پیچھے سے نکلی تھی اور ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے گھر کا راستہ بھول گئی تھی۔ وہ خودرو جھاڑیوں کے بیچ سے آہستہ آہستہ کھلے میدان کی طرف آرہی تھی مگر رک رک کر آسمان کی طرف دیکھتی تھی۔ مجھے یہ ایک منطقی بات لگی کیوں کہ آسمان کی طرف دیکھتے وقت وہ صرف ٹھہر سکتی تھی۔ چل نہیں سکتی تھی اور راستہ بھی انجانا تھا، پتھریلا اور اونچا نیچا۔ مگر وہ آسمان کی طرف کیوں دیکھ رہی تھی۔ یہ بات اس وقت میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں بھی ابھی ابھی شہر سے آیا تھا اور گاؤں جارہا تھا، اپنی بیمار بچّی کو شہر لے جانے کے لیے۔ حکیم صاحب نے کہا تھا کہ اب وہ ڈاکٹری علاج سے اچھّی ہوگی۔ ویسے حکیم صاحب کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمارے خاندان میں ڈاکٹری علاج کی روایت نہیں ہے بلکہ سارے گاؤں میں کوئی ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتا۔ ہمارے لئے تو حکمت ہی سب کچھ ہے۔ مگر شاید حکمت ناکام ہوگئی تھی ....... لیجیے۔ میں بھی کہاں بہک گیا۔ میں تو آپ کو اس مسافر بچّی کا حال سنا رہا تھا —— اوں، کیا بتایا تھا میں نے؟

"آپ یہ کہہ رہے تھے کہ وہ لڑکی کنکریلے پتھریلے راستوں پر چل رہی تھی، اور ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اور ٹھہرتی زیادہ تھی اور چلتی کم تھی کیوں کہ وہ دیر تک آسمان کی طرف دیکھتی رہتی تھی۔"

ہاں تو جب میں قریب پہنچا تو وہ آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے پاس کھڑا دیکھ کر جیسے چونک پڑی اور پہلے اس کے کہ میں کچھ پوچھوں، اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"سکبندرے پھر آئیں گے؟"

"کیا؟"

"سکبندرے۔ پٹاخے۔ ادھر نہیں آئے؟"

میں نے غور سے اس لڑکی کا چہرہ دیکھا۔ اس پر تھکاوٹ اور بھوک کے آثار تھے۔ میں اب بھی نہیں سمجھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ایک دم سے مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ مردہ آدمیوں اور جانوروں کی ہڈیوں سے تو نہیں ڈر رہی ہے۔ ایسی ہڈیاں فاسفورس گیس سے جل کر اڑتے ہوئے شعلوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ میں نے گاؤں میں اکثر یہ منظر دیکھا ہے یا شاید اس نے ستاروں کو ٹوٹتے اور شوٹ کرتے دیکھا ہے اور یہ سوچتے سوچتے میں گھبرا سا گیا۔ کیا یہ لڑکی رات بھر۔۔۔۔

"تم کب سے یہاں ہو؟"

"رات سے"

"کہاں سے آئی ہو؟"

"بس والے نے کہا کہ وہ اب آگے نہیں جائے گا بلکہ واپس جائے گا۔ میں گاؤں میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہاں لوگ رہتے ہیں، اور جہاں لوگ رہتے ہیں وہیں سکبندرے آتے ہیں۔ یہاں تو کوئی گھر نہیں ہے نا جو گر جائے۔ میں یہیں بیٹھی رہی۔"

لڑکی نے جلدی جلدی یہ سب کچھ کہا۔ مگر میرے سوال کا صحیح جواب نہ دیا۔ معصومیت۔ خوف۔ بیگانہ پن۔ معلوم نہیں کیا تھا کہ وہ شاید میرے سوالوں کو پوری طرح سمجھ بھی نہ سکتی تھی۔ میں نے کہا۔

"اچھا سنو۔ تم تھکی ہوئی ہو اور بھوک بھی لگی ہوگی۔ ہے نا۔۔۔" لڑکی نے اثبات یا انکار کا کوئی اشارہ نہ دیا۔

"وہ سامنے گاؤں ہے۔ اس میں میرا گھر ہے۔ وہیں چلتے ہیں۔ تھوڑی دیر آرام کرلو۔ پھر تمہیں لے جاؤں گا تمہارے گھر۔"

لڑکی ڈر سی گئی۔

"نہیں نہیں۔ اب وہاں گھر نہیں ہے۔ میں گھر ہی تو جارہی تھی جب پٹاخے چلنے لگے اور سکینڈرے اڑنے لگے۔ سب گھر گر گئے اور سب بھاگنے لگے۔ اسکول کے بچے۔ ماسٹر۔ میں بھی بھاگنے لگی اور سب کے ساتھ بس میں چڑھ گئی۔

لڑکی نے پٹاخوں اور سکینڈروں کی بات کرتے وقت کئی بار آسمان کی طرف دیکھا۔ میں نے سمجھا کہ شاید اس نے کوئی خواب دیکھا ہے یا شاید اس کا ذہنی توازن ... مگر بات چیت کرنے میں تو پتہ نہیں چلتا تھا۔ مجھے بھی دیر ہو رہی تھی۔ اپنی بیمار بچی کو کل ہی شہر لے جانا تھا۔ میں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا۔

"ادھر کوئی پٹاخے وغیرہ نہیں چھوٹتے۔ دیکھو نا سب گھر نظر آرہے ہیں۔ کوئی بھی گرا ہوا نہیں۔"

لڑکی راستے بھر خاموش رہی۔ اس نے صرف ایک سوال پوچھا۔

"آپ کے گھر میں بچے ہیں؟"

"ہاں کئی بچے ہیں؟"

"میرے گھر میں بھی میرے بھائی بہن تھے"

"تو کہاں گئے؟"

"معلوم نہیں۔ گھر تو گر گیا۔ وہ پٹاخے ...."

"اچھا اچھا ہم ڈھونڈیں گے تمہارے بھائی بہن کو۔"

"اور امی ابو کو بھی؟"

"ہاں۔ انھیں بھی۔"

گھر پہنچ کر میں اپنی بچی کی تیمارداری میں لگ گیا اور اسے اسپتال لے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ ابھی تک مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ لڑکی چوتھے درجے میں

پڑھتی تھی اور پکے مکان میں رہتی تھی جس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی کھاتے پیتے گھر کی ہوگی بس سکبندرے اور پٹاخے کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ رات کو میں نے اس کے رونے کی آواز بھی سنی اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔ ہمارے گاؤں اور شہر کے درمیان بہت اونچی پہاڑی حائل ہے۔ ہم تو خیر پہاڑی پر چڑھ کر نیچے اتر آتے ہیں مگر بس اور دوسری گاڑیاں ساری پہاڑی کا چکر کاٹ کر ادھر آتی ہیں۔ یہاں آبادی بھی بہت کم ہے۔ زیادہ تر بوڑھے لوگ ہیں جو اپنے ہی گاؤں میں مرنا پسند کرتے ہیں عورتیں اور بچے۔
اس لڑکی نے مجھے شہر کا نام بتایا تھا، مگر مجھے یقین نہ آیا۔ خصوصاً جب وہ گھر گرنے اور پٹاخے چھوٹنے کی بات کرتی تھی۔ میرے لیے عظمت اور آفت دو متضاد چیزیں تھیں، مگر میں عروج اور زوال کے بارے میں بھی سوچنے لگتا تھا اور پھر بہت سے خیال دماغ میں آنے لگتے تھے۔ زلزلہ، طوفان، منجنیق، جالا لکھی، پامپیائی، بغداد، ابرہہ، الرس پتہ نہیں کیا کیا۔ اب پوچھتا کس سے؟ گاؤں میں کوئی کچھ جانتا نہ تھا۔ لوگ مجھ سے ہی پوچھ رہے تھے کہ شہر کی کیا خبر ہے۔ زیادہ سے زیادہ اپنے چھوٹے شہر کی خبر بتا سکتا تھا، مگر بڑے شہر کے بارے میں مجھے کیا معلوم؟ ایک بڑے آدمی ہیں مستان شاہ، ان کے پاس ایک ریڈیو ہے جو ان کے بیٹے نے دبئی سے بھیجا ہے۔ شام کو لوگ ان کے گھر میں جمع ہو کر خبریں سنتے ہیں، مگر وہ بھی ایک ہفتے سے خراب پڑا ہے۔ وہ لوگ میرا ہی انتظار کر رہے تھے کہ میں اسے شہر لے جا کر ٹھیک کراؤں۔ ویسے مستان شاہ کے یہاں اس رات بہت بڑی دعوت تھی۔ مرغے، بکرے، دُنبے کٹے تھے اور وہ بچھڑا بھی ذبح کر دیا گیا تھا جو مستان شاہ نے بڑی عید کے لیے خریدا تھا۔ مریدوں کا بڑا قافلہ پاس پاس کے گاؤں سے آیا تھا۔ میں ذرا دیر سے پہنچا۔ ویسے سارا گاؤں دعوت میں شریک تھا۔
میں جب صبح کو اٹھا تو وہ لڑکی پہلے سے جاگ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ منہ ہاتھ دھو کر اور کچھ کھا پی کر اپنی بیٹی کو شہر لے جاؤں گا اور اس مہمان لڑکی کو بھی ساتھ

لے جاؤں گا۔ بڑے شہر میں ضرور اس کے ماں باپ کا پتہ لگ جائے گا۔ ویسے لڑکی سیانی ہے، پتہ نہیں کیوں بہکی بہکی باتیں کرتی ہے۔ شاید شہر پہنچ کر یہ ٹھیک ٹھاک ہو جائے، اور اپنا مکان تلاش کر لے، اور پھر مجھے بھی تو اپنی بیٹی کو ڈاکٹر کو دکھانا تھا۔ شاید اس کے گھر میں کچھ دن رہنے کا انتظام ہو جائے۔ میں اپنی کوٹھری میں بچّی کو اکیلے کیسے رکھوں گا؟

بس یہی سوچتے سوچتے میں اٹھ بیٹھا اور لڑکی سے کہا۔

"چلو بیٹی منہ ہاتھ دھو لیتے ہیں، لیکن پہلے ادھر جھاڑیوں میں چلیں، تمہیں بھی تو پیشاب پاخانہ کرنا ہوگا۔"

لڑکی مجھے غور سے دیکھتی رہی اور کچھ نہ بولی۔ میں نے سمجھا شہر کی لڑکی ہے اس کے گھر میں غسلخانہ ہوگا۔ اسے گاؤں کا دستور کیا معلوم۔ میں نے اسے سمجھانے کے لئے مزید وضاحت کی۔

"بیٹی یہاں کا یہی دستور ہے۔ یہاں گھر میں صرف رہنا اور کھانا ہوتا ہے، اور کام کے لئے جنگل جاتے ہیں۔"

یہ بات کہتے کہتے مجھے ہنسی آگئی، کچھ عمداً اور کچھ غیر شعوری طور پر۔ لیکن لڑکی کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا۔ خاموشی سے اٹھ کر میرے ساتھ ہولی۔

اپنے گھر کے پیچھے سے گزر کر میں نے ٹیلہ پار کیا۔ پھر مستان شاہ کے مکان کا چکّر کاٹ کر بائیں طرف والی جھاڑی میں جانے لگا تو رات کی دعوت کے آثار بکھرے ہوئے تھے، مرغی، دنبے، بکرے اور بچھڑے کے ناقابل خوردنی حصّے اور پھر فضلہ جات۔ میں نے لڑکی کو باتوں میں لگائے رکھنے کے لئے کہا۔

"دعوت تھی نا رات کو۔ اب دیکھو۔ مغرب کا ملک ہوتا تو انھیں صاف کر کے استعمال کر لیتے۔ ویسے تم نے تو دیکھا نہ ہوگا یا شاید دیکھا ہو۔ یہاں اتنے نہیں بنتے۔ پہلے تو کہتے تھے سب حرام ہے۔ مگر مستان شاہ کہتے تھے کہ دبئی میں بہت ہے اور جوار کے دوسرے ملکوں میں بھی۔ ظاہر ہے حلال ہوگا۔ وہی، بھلا سا نام ہے۔ شنگجی اور نقانق بھی

کہتے ہیں اور انگریزی میں سا سیج ۔ بس باریک قیمے کی گُلّی بناتے ہیں اور اس میں سے گندگی صاف کر کے جھلّی اوپر چڑھا دیتے ہیں ۔

لڑکی میری باتیں خاموشی سے سنتی رہی ۔ معلوم نہیں کتنی بات سمجھ سکی ۔ بس فضلے کی طرف اشارہ کر کے ایک سوال کیا ۔

"کیا ہے یہ ؟"

" یہ ، یہاں کے لوگ اسے اوجھڑی کہتے ہیں "

لڑکی ایک دم رک گئی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو ۔ اس نے میری طرف دیکھا ۔ پھر آسمان کی طرف، اور پھر بے تحاشہ بھاگنے لگی ۔ میں نے ایک لمحہ توقف کیا ۔ پھر غیر شعوری طور پر "کیا ہوا ، کیا ہوا ؟" کہتا ہوا اس کے پیچھے بھاگا ۔ ٹیلوں ، چٹانوں اور جھاڑیوں میں بھاگتا رہا لیکن وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ۔ آگے ایک اونچی اور عمودی چٹان نے میرا راستہ روک لیا ۔ اس کے دوسری جانب گہری کھائی تھی ۔ میں دوسرے راستے سے گیا ، لیکن کہیں اس کا سراغ نہ ملا ، اور آپ یہ بھی سن لیں ۔ میں اپنی بچّی کو شہر نہ لے جا سکا ۔ وہ دوسرے دن مر گئی ۔

" تو لکھ دیتے ہیں کہ وہ بھی مر گئی "

"مگر"

" بھائی پانچ ہزار تو مل ہی جائے گا ماں باپ کو ۔ مفقود الخبر لکھیں گے تو کچھ بھی نہ ملے گا "

"مگر"

جیپ کے انجن کی آواز ۔

# The Explioters

"بات کوئی اتنی مشکل نہ تھی کیوں کہ کوئیں اور ڈورا اور پلگ اور ساکٹ کے بارے میں تو معمولی آدمی کو تجربہ تھا۔ اس میں کون سا فلسفہ تھا۔ لیکن میری سمجھ میں جو بات نہیں آتی وہ یہ کہ استحصالی کون ہے اور فریادی کون؟"

"بس یہی تو فلسفہ ہے۔ اس نے اپنا منہ اس کی طرف پھیرتے ہوئے کہا" اور یہ شاید بیس منٹ کے بعد ہوا کیوں کہ اس نے اس کی بے تکی باتیں نہ سننے کے بجائے منہ پھیر لیا تھا اور آنکھیں بند کر لی تھیں، لیکن بات سب سنتا رہا اور شاید اب ایک ایسا مرحلہ آ گیا تھا کہ اُسے اپنے خیال کا اظہار کرنا ضروری تھا۔

"بات معمولی تھی مگر کسی تھیوری یا نظریے کے لیے غیر معمولی بات ضروری نہیں اور جو تجربہ میں بتا رہا ہوں وہ کم و بیش سب ہی کا ہے۔ بس میرا مشاہدہ زیادہ ہے اور شاید میں نے اسے تجسس کی نگاہوں سے دیکھا۔" وہ چند سکنڈ کے لیے خاموش ہو گیا تو وہ دوسرا کب صبر کرنے والا تھا۔ شانہ پکڑ کر زور سے ہلایا اور بولا۔

"پھر کیا ہوا، چپ کیوں ہو گئے؟"

اس نے اس کے ہاتھ کو شانے سے ہٹاتے ہوئے اسے یوں دیکھا جیسے وہ اس بے تکلف حرکت کو ASSAULT سمجھ رہا ہو، پھر مسکرا کر بولا۔

"بات یہ ہے کہ مجھے لال بجھکڑ کی بات یاد آ گئی۔ جب اس نے لوگوں سے پوچھا کہ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کیسے بنی، تو وہ حسب معمول چند منٹ تک آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا اور پھر ایسا لگا کہ جیسے اُسے روشنی مل گئی ہے۔ وجدان کے حالت میں بولا۔

لال بجھکڑ بوجھ گئے ہیں اور نہ بوجھے کوئے

کنواں کھود کر پہلے گہرا الٹ نہ دیا ہوئے

اور الٹے کنویں والی بات بالکل سچی ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ کنویں میں پانی ہوتا ہے اور الٹے کنویں کا پانی دیواروں اور زمین میں جذب ہو جاتا ہے، اور بے قابو ہو کر نکلتا ہے۔"

"تو پھر یہ ظالم و مظلوم اور فاعل و مفعول اور تھرسٹ اور دوری اور دریدگی کا جرم کیا؟"

"بس اس لئے کہ ایک مثل مشہور ہے کہ کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا۔

ہاں، مگر حقیقت کیا ہے؟ حقیقت اس کے برعکس ہے، کنواں ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی طرح بلند نہیں ہے۔ اسے فطرت نے جھاڑیوں میں چھپایا ہے پھر غیر فطرت نے مستور و محجوب اور محدود کرنا چاہا ہے۔"

"مگر یہ تو سب پرانی باتیں ہیں۔ ستر اور حد سب کلیشے ہیں، اور یہ بھی غلط ہے کہ سارے کنویں جھاڑیوں کے بیچ میں ہوتے ہیں۔ علاقے علاقے کی پکے کچے کی بات ہے۔"

"غلط تو یہ بھی ہے کہ صرف پیاسا کنویں کے پاس آتا ہے۔ کنویں میں جھانک کر آواز دو، خوش آمدید کی آواز آئے گی۔"

"معلوم نہیں۔ خوش آمدید کی بھی آتی ہے اور بھاگ جاؤ کی بھی۔"

"یہ تو تمہاری سماعت کی صلاحیت کی بات ہے کہ تم کیا سنتے ہو۔ . . . . نہیں نہیں تمہاری سمجھ کا بھی دخل ہے کہ تم کیا سمجھتے ہو۔"

ٹھٹا۔ ٹھٹا۔ ٹھٹا!

"کیا بچوں کو مار دیا۔ اپنے آپ کو کیوں نہیں؟"

"کہتا تھا میں ڈوب گیا اور جو برآمد ہوا وہ میری لاش تو چبا رہا۔"

"بیچارہ۔ لیکن یہ تو پیاس کی بات تھی جسے بجھانے کے لئے ڈور ڈالی اور پانی نکالا۔ نتیجے کا علم کسے تھا۔ اپنے کئے پر پچھتاتا تو خود کشی کر لیتا۔"

"پھر استحصال والی بات تو صحیح ہوئی نا۔"

"ہاں! شاید۔ مگر بہت بعد میں۔ پدری سماج میں، مادری سماج میں تو اسے ٹھٹا ٹھا

کی ضرورت نہیں تھی۔ ٹھاٹھا تو کسی کرب کا نتیجہ ہوتا ہے۔"

"کرب نہیں تو ٹھک ٹھک کیسی؟"

"ٹھک ٹھک نہیں ٹھاٹھا"

"لیکن ٹھک ٹھک بھی تو اسی فلسفے کا حصّہ ہے۔ فاعل و مفعول استحصالی و استحصال"

"صرف استحصال کی بات کرتے ہو، استیصال کی نہیں"

"وہ تیسرا جو ایک کونے میں پڑا سو رہا تھا، اپنے منہ پر سے چادر ہٹا کر بولا۔

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"بس وہی ہوتا ہے۔ باقی خانہ پُری، معلّقیت استیصالی جہت کا نتیجہ ہیں، اور اسی نتیجے میں ظاہر کچھ ہوتا ہے باطن کچھ، جمی ہوئی اور دبی ہوئی چیزیں معلق ہوتی ہیں اور ہمیشہ معلق رہتی ہیں۔ انھیں پھر اپنی جڑ نہیں ملتی، اور معلّق چیزیں جم جاتی ہیں اور مرکز سے حکم صادر کرتی ہیں اور منطق کے مارے سمجھتے ہیں کہ شیام کا نظام اور بلّے کا سیندور اور مولوی کے بول اور گرجا کا "ہا ہا ہا" ان کو شخصیت دیتا ہے۔"

"ہم تو اب تک یہی سمجھتے رہے"

"تم غلط سمجھتے رہے۔ تمھاری شخصیت کا استیصال ہوتا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تم ایڈلر کے یورنیل میں جا کر کاربن ڈائی آکسائیڈ اپنے پھیپھڑوں میں بھر لو اور سینہ پھلا پھلا کر اپنے احساس کمتری کو دباتے رہو۔

جلوس قریب آگیا تھا، اور تینوں کو جو غیر متعلق تھے اپنے خیالات و سوالات جلوس کے لفظ کی طرح ڈی کنسٹرکٹ ہوتے دکھائی دینے لگے۔ دوسرے نے کہا: "یہ جلوس اس حرکت کرتے ہوئے جانداروں کا نام کس نے رکھا"

یہ تو ہماری زبانوں پر اور ہمارے ذہنوں پر سوار ہو گیا ہے۔ تاریخ کسے معلوم ہے کہ

"لیکن یہ لفظ تو ڈی کنسٹرکٹ ہو گیا"

"وہ کس طرح؟"

بھائی جلوس کے معنی تو بیٹھے ہوئے لوگوں کے ہوتے ہیں۔ یہاں چلتے ہوئے لوگوں کو

جلوس کہتے ہیں، حقیقت کیا ہے؟ چل رہے ہیں یا بیٹھے ہیں؟"

"بھائی ابھی یہ چل رہے ہیں مگر اصل میں یہ بیٹھیں گے اور اس طرح کہ اُٹھنے کا نام نہ لیں گے۔ بیٹھنے کے معنیٰ التوا میں ہیں۔ ہاں بالکل اس طرح جس طرح ہڑپ کرنے والے کو مظلوم اور ہڑپ کئے جانے والے کو ظالم کہا جاتا ہے۔ ظالم جو پسینہ بہاتا ہے اور مظلوم جو کھاتا ہے، ظالم جو کنویں کا رکھوالا بھی ہے اور برآمد ہونے والے کیڑوں مکوڑوں کا پروائڈر۔ اور ہزاروں سال سے ہزاروں سال تک چٹانوں کو کندھوں پر اُٹھائے سیسیفس کی طرح بلندی پر چڑھتا ہے اور چوٹی پر پہنچنے سے پہلے ڈی کنسٹرکٹ ہو جاتا ہے۔ اور پھر چڑھتا ہے۔ اور پھر اور پھر"۔.... AD INFINITY لیکن وہ وہ نہیں جو ہے۔ بلکہ وہ جو نہیں ہے"

جلوس اور قریب آ گیا۔ طرح طرح کے نعرے بڑی مترنّم آوازیں سنائی دے رہے تھے۔

"ہم پسلی کی پیداوار نہیں ہیں۔ ہمارا وجود اور ہماری ONTOLOGY دونوں INDEPENDENT ہیں"

"کائنات میں رنگ ہم سے نہیں ہے"

اور وہ دوسرا بولا "ٹھیک تو ہے۔ کائنات میں رنگ تو قوسِ قزح سے ہے۔ رنگ والی بات تو واقعی استحصالی نمونہ ہے جو آسانی سے DECONSTRUCT ہو سکتی ہے"

"بھئی رنگ استعارہ ہے۔ رنگ یعنی جمالیات"

"غلط" پہلے نے کہا "کیا میرے دَم سے جمالیات نہیں ہے"

قہقہہ

"ٹھیک تو ہو۔ ڈارون نے کہا ہے کہ جمالیات صرف ان میں نہیں ہم میں بھی ہے۔ اور تطوری عمل میں ہم بھی اتنے ہی خوب صورت ہیں"

ایک اور قہقہہ

جلوس اور قریب آ گیا۔

نعرے "برابر" "برابر" "برابر"

پہلا (چیخ کر) کون کہتا ہے برابر نہیں مگر ہمیں ہڑپ کرنے والے کیا ہمارا استحصال نہیں کرتے......

دوسرا (اور زور سے چیخ کر) جثہ کی طاقت کافی نہیں ہوتی۔ طاقت کا مرکز ہمارے حق کا ضامن ہے۔ اور ہمارے استحصال کا پرائما کازا......

تیسرے نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ جلوس بالکل قریب سے گزرنے لگا (جلوس میں سے کچھ نے اس کی آواز سن لی۔ یہ سننے والے وہ نہیں تھے، بلکہ اس کے ہم جنس جلوس کے حامی تھے۔ وہ اس کی طرف لپکے۔ تینوں بھاگے اور بھاگتے بھاگتے کچھ بولتے رہے۔ جلوس کی آواز، قدموں کی آواز، پھڑکتی ہوئی سانسوں کی آواز، سب مل کر گرتی پڑتی مبہم مبہم، فونو گرافک اتار چڑھاؤ کے ساتھ دیر تک سنائی دیتی رہی۔

اور جب دونوں نے گلی کے دوسرے سرے پر نیم تعمیر شدہ کثیر المنزلہ عمارت کے سائے میں دم لیا جس کا NOC نظرثانی کے بعد کینسل ہو گیا تھا۔ تو تھوڑی دیر تک تو تینوں خاموش رہے۔

ایک نے کہا: کتنی آزادی اور کیسی آزادی؟

دوسرے نے کہا: شکایت غلط، دعویٰ غلط، اور کیا برابری چاہیئے۔ جسمانی میٹامورفیسس تو ہو ہی نہیں سکتا۔

تیسرے نے کہا: اس کی ضرورت کیا ہے۔ یہ سب تو ہزاروں سال کی کنڈیشننگ کا نتیجہ ہے ورنہ بات الٹی ہے۔ یعنی وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ نرمی اور محدودیت دوسری جانب وسعت اور لامحدودیت۔ بےچارے۔

اور گلی کے اس پار دوسری منزل سے آواز صاف آ رہی تھی۔

آخر تمہیں کیا چاہیئے؟

کچھ نہیں۔

پھر یہ کیوں؟

یہ ریہ تو احساس دلاتا ہے کہ تمہاری طرح ہمیں بھی جب اور جہاں اور جس وقت انتخاب کی آزادی چاہیئے۔

مگر وہ تو ہے۔ کھلے عام نہ سہی۔

یہی تو بات ہے۔ کان ادھر لاؤ۔ یہ سب تمہارے خلاف نہیں ہے۔ تم تو واقعی بے چارے ہو۔

پھر؟

پھر۔ تم تو جو کرو ہو۔ ہر جگہ نٹ ہو جاتے ہو۔ ہم تو اس سے نبرد آزما ہیں۔ پسلی اور شیطان کی روایت سے۔

تو کیا یہ غلط ہے؟

غلط تو ہے۔ مفعول کو فاعل سمجھنا تو ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔ اور یہ کہہ کر بالٹی کا گندہ پانی اس نے بالکنی سے نیچے پھینک دیا۔ تینوں ممی اور بدبو کو سمیٹتے گلی سے باہر بھاگے۔

O

# آرٹمس نگر کے پھول

ویسے کسی نے ارادی طور پر اسے وہاں نہیں لگایا تھا۔ بس خودرو تھی دوسری جھاڑیوں کی طرح، اور میں نے تو جب دیکھا جب اس کی شاخیں بے چینی سے ہل رہی تھیں۔ کبھی بہت ہی ہلکے ہلکے اور کبھی بہت زور سے، اور یہی نہیں تھا کہ میں اسے دیکھ کر خوش ہوتا تھا بلکہ مجھے ایسا لگنے لگتا تھا جیسے مختلف لَے اور تان کے نغمے فضا میں بکھرنے لگے ہیں۔

ایک دن میں یونہی ٹہنیوں کو لہراتے ہوئے اور ان پر کھلے ہوئے دو پھولوں کو خراماں خراماں اوپر نیچے ہوتے دیکھ رہا تھا کہ وہ آ گیا۔ ایک ہاتھ میں بیلچا اور دوسرے میں فوّارہ لیے ہوئے اور مجھ سے کہنے لگا۔ کیسا لگتا ہے؟ میں نے کہا "بہت اچھا" کہنے لگا "لچک بہت ہے!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ کہنے لگا "اُٹھان کیسی ہے؟" میں نے کہا "بہت خوب" کہنے لگا "کیا ہو جاتا ہے؟" میں نے کہا "مدہوشی" کہنے لگا "صرف دیکھتے رہتے ہو" میں نے کہا "نہیں سُنتا بھی ہوں" اس نے کہا "کیا سنتے ہو؟" میں نے کہا "ترنم۔ گیت" اس نے کہا "کون سا؟" میں نے کہا "سب کچھ ملا جلا۔ بالکل آٹھویں سُر کی طرح" وہ زور سے ہنسا اور بولا "اور؟" میں نے کہا "اور کچھ نہیں" اس نے کہا "بولتے نہیں" مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کچھ کہا نہیں لیکن دوسری اُور دیکھنے لگا۔ معلوم نہیں کیوں جب کوئی بولنے کی بات کرتا ہے تو مجھے غصہ آ جاتا ہے اور میں اکثر سوچتا ہوں، کاش کہ نطق نہ ہوتا۔ نطق سے منطق اور منطق سے تکلف اور تکلف سے ماسک اور ماسک کیا کیا نہیں چھپاتا۔ مگر ماسک سے کیا

کام چلتا ہے۔ تراش خراش تو رُکتی نہیں۔ اس نے مجھے منہ پھیرتے دیکھا تو پھر زور سے ہنسا اور بیلچا زمین پر مارا۔ "نہ بولو، چیخنا تو پڑے گا ایک دن۔" یہ کہہ کر اس نے پانی کا فوّارا چھوڑا اور میری فطری خنکی تھوڑی دیر کے لیے معدوم ہو گئی۔ جب میں جانے کے لیے مڑا تو مجھے ایک درد بھری آواز سنائی دی۔ اِکو! میں نے مڑ کر دیکھا پھر مجھے فوراً ہی خیال آیا۔ یہ دیوی تو دکھائی دیتی نہیں۔ بس آواز ہی سُنائی دیتی ہے اور مجھے بڑا غصّہ آیا۔ میں نے ہیرا پر لعنت بھیجنی چاہی مگر خاموش ہو گیا۔ شاید زیوس اب بھی زندہ ہو۔ میں نے سوچا، اور ہیرا بھی تو غیر فانی ہے۔ حسد کی دیوی — میں نے غیر شعوری طور پر آواز کی جانب رُخ کیا۔ وہ بیلچا اور فوّارا لیے کھڑا تھا۔ بیلچا اس نے کندھے پر رکھ لیا تھا اور فوّارے کو زور زور سے ہلا رہا تھا جیسے اس کا پانی ختم ہو گیا ہو۔ وہ پھر زور سے ہنسا اور پھر چیخ کر کہا۔

NYMPHOMANIAC

میری کچھ سمجھ میں نہ آیا، لیکن میں جانتا تھا کہ اس نے کوئی اچھی بات نہ کہی ہو گی۔ وہ میرے متعلّق کوئی اچھی بات کہے، میں تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا، معلوم نہیں کیوں! شاید مجھے بزدل سمجھتا ہو۔ شاید مجھے بیوقوف سمجھتا ہو۔ شاید مجھے — اب اور کیا کہوں! ویسے میری مجبوری کا اسے علم نہ تھا ورنہ اس نے وہ اِن ویزیبل ڈوری دیکھی تھی جو نکلتے وقت اور چلتے وقت اور دیکھتے وقت اور سُنتے وقت میرے پیر کے انگوٹھے سے بندھی ہوتی تھی اور پیر ٹیڑھا پڑنے پر میری تمام نروس سسٹم دماغ میں خوفناک سگنل بھیجنے لگتی تھی، اور پھر اس ڈوری کے سارے دھاگے الگ الگ ہو کر میری ساری انگلیوں میں پھنس جاتے تھے اور میں بالکل مفلوج ہو جاتا تھا۔ صرف آنکھیں گردش کرتی رہتی تھیں اور کچھ نہیں۔

عام طور سے دوست احباب اسی لئے ہوتے ہیں کہ ان سے ایسی باتیں کہی جا سکیں جو کسی اور سے نہیں کہی جا سکتیں، لیکن وہ جو میرے ساتھ رہتا تھا کسی بات کا ٹھیک سے جواب نہ دیتا تھا۔ عمداً یا جبراً میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر میں دس بارہ الفاظ کا ایک جملہ ادا کرتا تھا، اور آخری لفظ پر زور دیتا تھا تاکہ وہ سوالیہ نشان کو بھی میرے جملے کا حصّہ ٹھیک سے سمجھ

سکے، مگر پورے جملے کا جواب وہ ہوں، ناں میں دیتا تھا اور کبھی کبھی تو صرف گردن ہلا دیتا تھا۔ مثلاً یہ کہ میں کہتا تھا کہ یہ ٹہنیاں یونہی خراماں ہلتی رہیں گی۔ وہ کہتا تھا نہیں۔ وجہ نہیں بتاتا تھا۔ میں کہتا تھا آندھی آئے گی۔ وہ کہتا تھا ہوں۔ آگے کچھ نہیں۔ میں کہتا تھا ہریالی قائم رہے گی۔ وہ کہتا، نہیں۔ میں کہتا تھا، پت جھڑ طے جائے گا۔ وہ گردن ہلاتا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں چپکے سے اس کے پیچھے چلا جاؤں اور اس کی بے خبری میں اس کی پیٹھ پر سے قمیض چاک چاک کر ڈالوں تاکہ وہ ننگا ہو جائے اور بھاگ جائے اور آج میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر اس نے میرے آخری سوال کا جواب نہ دیا تو میں ایسا ہی کروں گا، اور میں نے آخری سوال کیا وہ (اور میں نے ایک عام فہم سی گالی دی) وہ سیڈسٹ ہے۔

"نہیں" وہ ایک لمحہ خاموش رہا اور میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر اسے معدوم کرنے ہی والا تھا کہ اس نے بولنا شروع کیا۔ وہ نہ سیڈسٹ ہے اور نہ تم پوسیدون، لیکن تم کیا کرو گے۔ بہت سے سیڈسٹ ہیں اور کوئی نہ کوئی کسی دوناند کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ کوئی منع نہیں کرتا؟ میں نے سوال کیا۔ کیوں منع کرے گا۔ اس نے کہا۔ یہ تو آرٹمس کا علاقہ ہے اور یہاں کی دوناندا اسی لئے ہوتی ہیں کہ ان کو دوڑا کر پکڑ لیا جائے۔ میں کچھ سوچنے لگا۔ شاید وہ اسی لئے ہنستا تھا اور شاید مجھے چٹان پر بیٹھ کر صنّاعی کا نظّارہ کرنے کے بجائے ہاتھوں اور پیروں کو جنبش دینے کا متمنّی تھا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ وہ میرا مطلب سمجھ گیا۔ تو بولا۔ سوچنا بیکار ہے۔ تم پوسیدون نہیں ہو سکتے، تم تو دو پلوں کے درمیان پھنسے ہو۔ EQUAL AND OPPOSITE FORCE۔ تمہاری جمالیاتی حِس تو کب کی مجروح ہو چکی اور اب جو کچھ ہے وہ کرب ہے اور کرب اسٹیٹکل ڈائنمک ہوتا ہے۔

STATICAL DYNAMIC

شاید میرے دوست نے صحیح کہا تھا۔ سویرے سویرے میں گیا تو وہ کھڑا تھا۔ آج اس کے ہاتھ میں صرف بیلچا تھا۔ فوّارا نہیں۔ وہ بیلچے سے ادرگرد کی جھاڑیاں صاف کر رہا تھا۔ لیکن آج وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے پاس کوئی اور بھی تھا اور وہ اس کی ٹہنیوں، پھولوں اور ارد گرد کے رنگوں کی طرف اشارہ کر کے مسکرا رہا تھا اور انگلیوں

کو نچا رہا تھا۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی اور ایک دم خاموش ہو گیا۔ اس کے پاس کھڑے ہوئے آدمی نے بھی میری طرف دیکھا۔ پھر دونوں انگلیاں نچانے لگے۔ اس نے بُرا سا منہ بنایا پھر ایک انگلی اپنے سر کے پاس گھمائی۔ پھر ٹہنیوں اور پھولوں کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف دیکھا اور پھر ایک طرف منہ کر کے تھوکا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف جانے لگا۔ جاتے جاتے دونوں نے مجھے مڑ کر دیکھا۔ دوسرا آدمی قدرے مسکرایا۔ پھر دونوں آرٹمس کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ آج پھر میں نے اپنے دوست کو وہ سب کچھ بتا دیا جو دیکھا اور اس بات پر زیادہ زور دیا کہ آج اس کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا۔ اسے کچھ تعجب نہ ہوا۔ اس نے کہا ٹھیکیدار ہوگا۔ میں نے پوچھا وہ کون؟۔ اس نے کہا۔ وہی جو آرٹمس کے علاقے میں ہر جگہ گھومتے پھرتے ہیں۔ کبھی سیٹھ بن کر کبھی پوسیدون بن کر۔ سودا کرتے ہیں اور پھر؟ میں نے پوچھا۔ پھر لے جاتے ہیں، لیکن وہ بیلچے والا، اسی نے اُسے اگایا ہے۔ قیمت وصول کرے گا۔ میں نے کوئی اور سوال نہ کیا۔ جی تو چاہتا تھا کہ رات بھر اسی کی باتیں کرتا رہوں۔ بہت سے سوال دل میں اٹھتے تھے، مگر پھر خیال آتا تھا کہ میں ان باتوں کو پوچھ کر کیا کروں گا۔ ہونی اور انہونی میرے لیے دونوں برابر ہیں۔

میں رات بھر نہ سو سکا اور بہت سویرے وہاں پہنچا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک ٹریکٹر آیا اور پھر ایک ٹرک۔ کئی مزدور اس ٹرک سے نیچے اترے۔ سب کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اور دوسرا وہ جسے میں نے کل دیکھا تھا اور جسے میرے دوست نے ٹھیکیدار بتایا تھا ایک جھاڑی کی اُوٹ سے برآمد ہوئے اور ایک سُرخ رنگ کی دری بچھا کر بیٹھ گئے۔ پھر اس دوسرے آدمی نے کہا۔ جلدی کرو، اور کھٹ کھٹ کی آوازیں آنے لگیں پھر میرے کانوں میں ایک دھماکے کی طرح کچھ محسوس ہوا، پھر میں نے دیکھا کہ ٹریکٹر اسے لے کر جانے لگا۔ اس کی ٹہنیاں رگڑ رہی تھیں اور اس کی خوب صورت اور لچک دار شاخیں کھردری سطح پر زخمی ہو رہی تھیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے لوتس دیوی کے بدن سے خون جاری ہو۔ پھر میں نے اُسے آخری بار دیکھا۔ دونوں پھول سطح اور تنے کے بیچ میں مسلے جا رہے تھے۔ میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور

میں دوڑ کر اُس کے قریب پہنچا۔ ٹریکٹر جا چکا تھا۔ وہاں صرف ایک سوراخ تھا جو وہ اپنے بیلچے سے مٹی ڈال کر چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے مجھے دیکھا، لیکن اس بار مجھے دیکھ کر ہنسا نہیں۔ کہنے لگا "آخر جینئے تا ـــــــ آج تک کیوں نہیں بولے؟" میں نے گردن نیچے کر لی۔ اپنی ڈوری اور انگوٹھے اور نروس سسٹم کی بات اسے کیا بتاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بدستور مجھے دیکھ رہا تھا، مگر ہنس نہیں رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ کیا کرے گا؟ بولا "بڑا سڈول تنا تھا۔ کشتی بنائے گا اور پتوار چلائے گا۔" پھر وہ ہنسا اور بولا "کیا سمجھے، یہ آرتمس کا علاقہ ہے۔ ان سڈول تنوں کا یہی مقدر ہے۔

O

طبقاتی فرق نیک خواہشات پر بھی ضرب لگاتا ہے۔ بورژوا سوسائٹی کی برتری کا احساس ہر محبت اور انسانیت کے جذبے پر غالب آتا ہے۔ لیکن یہ محض اس تاریخی تطور پر منحصر نہیں جس کی نشاندہی اشتراکیت کے علم برداروں نے کی تھی۔ طبقاتی فرق قبیلوں کی پریمیٹیو ساخت میں بھی ملتا ہے جہاں مساوات اور مذہب مقدّم سمجھے جاتے ہیں۔

# پسلی کی پاداش

"ہماری صدی بوڑھی ہو چکی اور آدمی کا قد زمین سے آسمان تک اور روشنی دیئے سے لیزر تک پہنچ چکی ہے لیکن ہم اندھیروں کے رسیا ہیں اور مقبروں میں رہتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے گرد مردہ قدروں اور بے جان معاشرے کا حصار ہے اور ہم اُسے توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

یہ الفاظ ایک امیر زادی کی زبان سے ادا ہوئے تھے اور تھوڑی دیر کے لیے مجھے تعجب ہوا۔ پھر میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں امیرانہ لبادہ اتارا اور امیر زادی کو ایک عورت کے روپ میں دیکھا اور میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ امیر زادی کے بدن کے گندمی رنگ میں، میں نے بہت سے الوان کی آمیزش دیکھی۔ قبیلے کی سرداری کا رنگ جو تین سو سال سے خونی خلیوں میں حرکت کر رہا تھا۔ شاہی مناردوں کا رنگ جو ساٹھ سال سے ورید کو سرخ کر رہا تھا۔ پھر میں نے جدید رویوں کے رنگوں کو امیر زادی کے اعصاب نظامِ السمتادی[1] پر مسلط ہوتے دیکھا اور امیر زادی میں ہمت دیکھی، اقدام دیکھے، جنگ دیکھی اور بکائیہ کے جامعہ کے باہر اس کے کلاس فیلو کمال کو دیکھا۔ دونوں اس مخلوط تعلیم گاہ کے طالب علم تھے اور کمال میرے سوال کا جواب دے رہا تھا۔

"سامیہ کے لوگ اندھیروں سے اجالوں میں آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر سائے ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے، لیکن جب وہ سرحدیں

---

[1] SYMPATHETIC NERVOUS SYSTEM

پار کرتے ہیں تو وہاں پھیلے ہوئے اجالوں سے بھرپور فائدہ

اُٹھاتے ہیں "

اور مجھے ایرپورٹ کا منظر یاد آ گیا۔ سر سے پیر تک برقعے میں لپٹی عورتوں نے پہلے نقاب ہٹائی اور پھر برقعے اتارے اور انھیں تہہ کر کے احتیاط سے سوٹ کیس میں رکھا پھر بیوٹی بکس کو کھولا، آئینے میں اپنا حسین چہرہ دیکھا۔ پھر اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ پھر لپ اسٹک ہونٹوں پر لگائی۔ پھر اسے ٹشو پیپر سے برابر کیا۔ پھر آئی بروپنسل نکالی اور ابرو پر پھیری۔ پھر آئینہ دیکھا اور بیوٹی بکس کو ہاتھ میں لے کر چست بلاؤز اور اسکرٹ میں فطرت کے آرٹ کا انمول متحرک نمونہ بن گئیں اور اپنے شخص سے گلے مل کر خوب صورت گردن اور سر کو بلند کیے ہوئے اپنی سانسوں کی خوشبو ہوا میں بکھیرنے لگیں۔ اور کمال کہہ رہا تھا۔

"اور یہاں پہنچ کر جمیلہ کو اپنے شخص کا احساس ہوا اور جبر کے کرب سے آزادی پانے کا احساس ہوا اور وہ ہم میں سے ایک ہو گئی "

میں نے پوچھا۔

"کیا زندہ اور مردہ پرکھوں کی لکڑیں سرحد کو پار کرنے سے قاصر ہیں "

"نہیں وہ سب کچھ دیکھتی ہیں اور سب کچھ سمجھتی ہیں اور خوش ہوتی ہیں اور نظر انداز کرتی ہیں کیوں کہ ان کے جسموں پر ابھی تک ان کے پرکھوں کی روحوں کا قبضہ ہے اور وہ انھیں تقویت دیتا ہے اور ان کے اونچے تخت کو اور اپنے محلوں کو سنبھالے ہوئے ہے "

اور پھر کمال نے اپنے متعلق بتایا۔ وہ ایک صراف کا بیٹا تھا جو ایک بڑا تاجر بن گیا اور اب ملک سے باہر ایک بڑے جامعہ کے اخراجات کا متحمل ہو سکتا تھا اور پھر اس خوب صورت خدوخال اور جثہ کے نوجوان نے اپنے اور جمیلہ کے لگاؤ کے بارے میں بتایا اور ٹھنڈی سانس لی۔

پھر بولا۔

"میں امیرزادی کے خاندان کی رعیت میں سے ہوں۔ صرف ایک کامنر اور اس ضمن میں الوہی اور آدمی اور انسانی احکام میری مدد سے قاصر ہیں "

میری ملاقات کمال اور جمیلہ سے اتفاقیہ طور پر ہوگئی تھی۔ میں بکائیہ یونیورسٹی کے قریب ایک وادی میں خوب صورت مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ یہ وادی دنیا کی خوب صورت ترین وادیوں میں سے تھی۔ اور روایتوں کے مطابق حضرت نوح کا سفینہ یہیں کہیں رُکا تھا۔ اور اسی جگہ طوفان کے بعد پہلی عبادت گاہ بنی۔ ہر طرف پھول ہی پھول نظر آ رہے تھے۔ ڈھلوان اور نیچی نیچی چٹانوں پر انگور کی بیلیں نئی نویلی دلہن کے سہرے کی لڑیوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ زیتون کے درخت اس طرح اُگے ہوئے تھے جیسے ہمارے جنگلوں میں کیکر اور ڈھاک کے درخت ہوتے ہیں۔ کئی رنگوں کے پودے سفید، نارنجی اور سرخ پھولوں سے اٹے ہوئے تھے۔ پاس ہی ایک خوب صورت ریستوران تھا اس کی لان میں نہ کوئی بینچ تھا اور نہ ارادی کوشش سے اُگائے ہوئے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ خود رو ریشمی گھاس اور اس کے درمیان بے ہنگم پھول اور پودے فطری بے لباسی کا نمونہ پیش کر رہے تھے اس ریستوران سے پرے ہٹ کر کیکٹس کے طرح طرح کے پودے اُگے ہوئے تھے۔ اور ان کے مینوش پھول اور پتے فضا کو مخمور کر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس مقام پر ریگستان اور نخلستان دونوں گلے ملتے ہیں اور ایک دوسرے کی لطیف سانسیں جذب کر لیتے ہیں۔

میں اور میرا دوست ساشر جس جگہ بیٹھے تھے اس کے قریب ایک حسین جوڑا ماحول سے بے خبر گفتگو میں مصروف تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ نوجوان سگریٹ ہونٹوں میں دبائے ہوئے اپنا لائٹر بار بار جلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب لائٹر نہیں جلا تو اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا اور میری طرف مخاطب ہو کر بولا۔

"آپ مجھے لائٹ دے سکتے ہیں؟"

میں نے اپنا لائٹر جلایا اور اس کے ہونٹوں کے قریب کر دیا۔ اس نے سگریٹ جلا کر میرا شکریہ ادا کیا اور اپنی میز کی طرف جانے والا تھا کہ میں نے اپنے کو متعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میرا نام عبداللہ ہے اور میں یہاں گھومنے پھرنے کے لیے آیا ہوں"

اس نوجوان نے مڑ کر مجھے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر بولا۔

"میں کمال ہوں۔ بکائیہ یونیورسٹی کا طالب علم ہوں" اور اس کے ساتھ ہی اس نے مجھ سے اور میرے دوست سے مصافحہ کیا اور بولا۔

"اسی طرف آجائیے۔ اپنی کرسیاں لیتے آئیے" یہ کہہ کر اس نے میری کرسی اٹھانے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنی کرسی پکڑ کر کہا۔

"میں خود لاتا ہوں۔ آپ چلئے"

ہم دونوں میز کے قریب پہنچے تو کمال نے اپنے ساتھی سے تعارف کرایا۔

جمیلہ یہ عبداللہ ہیں اور یہ راشد۔ راشد ہماری ہی یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں، لیکن شعبہ دوسرا ہونے کی وجہ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور مسٹر عبداللہ سیر سپاٹے کے لئے آئے ہیں۔

جمیلہ نے ہم سے ہاتھ ملایا اور ہماری مزاج پرسی کی۔ کمال نے تعارف کرایا۔

"امیرہ جمیلہ۔ سامیہ کے امیر کی بیٹی۔ میری کلاس فیلو"

مجھے صرف جمیلہ کہئے۔ یہاں میں صرف جمیلہ ہوں اور کاش کہ ہر جگہ جمیلہ ہوتی۔

جمیلہ بڑی سوشل تھی۔ اور تعجب تھا کہ اس کو اپنے اور ریحن کا خیال تک نہ آتا تھا۔ ہر طبقے کے لوگوں سے گھل مل کر بات کرتی تھی اور تھوڑی دیر میں اسے اپنا گرویدہ بنالیتی تھی۔ اس کے برتاؤ سے اکثر لوگوں کو اپنے متعلق غلط فہمی ہو جاتی تھی لیکن جب غلط فہمی وبا کی طرح پھیلی اور مریضوں نے ایک دوسرے کو اپنا دکھڑا سنایا تو انھیں اپنے عارضی بخار کا احساس ہوا اور پھر انھوں نے مسکراہٹ اور ہنسی اور خوش کلامی اور قربت، لمس اور بغل گیری کو اپنی ذات سے الگ کر کے دیکھا تو سب کچھ نارمل تھا۔ عوامی تھا۔ ایپکیوریئن تھا تھا۔ نہیں تھا۔

ایک دن بکائیہ میں آندھی آئی۔ آسمان پر کالے بادل چھاگئے۔ لوگ اندھیرے میں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ اپنے کو بچانے کے لیے دوسروں کو سہارا دینا بھول گئے۔ وادی ویران ہوگئی۔ اور پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آنے والے نغمے اور قہقہے آہوں اور کراہوں اور چیخوں میں بدل گئے اور زیاینہ میں پلے ہوئے ٹڈی دلوں نے پھول اور پتوں اور

پھلوں کو کھا کر پودوں اور درختوں اور زمینوں کو خزاں زدہ کر دیا۔

اور اس ہنگامے میں ہم جانے کے لیے تیار ہوئے اور سرحد تک کمال اور جمیلہ کا راستہ بھی شاید ایک ہی تھا اس کے بعد انہیں بھی اپنی راہوں اور منزلوں کا علم نہ تھا کیونکہ جمیلہ نے مجھے وداع کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اب ہم بھی چلے جائیں گے۔ یونیورسٹی بند ہونے کو ہے۔ مجھے سامیہ جانا پڑے گا۔ میرے گھر والے اسی پر مصر ہیں۔ حالانکہ میں آگے جانا چاہتی ہوں۔ پیچھے نہیں۔

"تو کیا ہوا۔ حالات درست تو ہو ہی جائیں گے۔ واپس آجائیے گا۔"

"میں کمال کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"مگر وہ بھی تو سامیہ جا رہا ہے۔"

"ہاں، مگر وہاں کی قربت ہمارے فاصلے کو زیادہ کر دیتی ہے۔ کمال ایک کامنر ہے اور میں اسپیشل، اور پھر اس نے ہنس کر کہا۔ میں امیر زادی ہوں عبداللہ، اور میرے جسم پر پلاسٹک کا خول ہے اور دماغ میں آئی بی ایم کا منی کمپیوٹر جس کا سوفٹ ویر سام میں بنتا ہے اور میرے پہنچتے ہی فیڈ کر دیا جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسی اور یہ اس کی آخری ہنسی تھی جو میں نے سنی تھی۔ میں واپس اپنے ملک چلا گیا اور ایک سال کے بعد پھر بکائیہ جانے کا موقع ملا۔ اور ایک دن میں نے راشد سے پوچھا۔

"راشد۔ کیا کمال اور جمیلہ سے تمہاری ملاقات پھر کبھی ہوئی؟"

راشد نے مجھے بغور دیکھا۔ پھر اپنی چائے کی پیالی کی طرف دیکھا اور پیالی اٹھا کر ایک گھونٹ چائے پی۔ پھر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اور اسے کھول کر میری طرف بڑھایا۔ پھر خود ایک سگریٹ نکالا اور اسے سلگایا۔ لیکن اس دوران نہ میری طرف دیکھا اور نہ مجھ سے بات کی۔

میں نے اپنا سوال دُہرایا۔

"بتایا نہیں تم نے، کمال سے یا جمیلہ سے دوبارہ ملاقات ہوئی تمہاری۔"

نہیں۔ ان سے اس دنیا میں ملاقات نہیں ہو سکتی۔ وہ مر چکے ہیں۔

پہلے میں نے راشد کی بات دوبارہ سننے کی کوشش کی اس لیے کہ مجھے اپنی قوّت سماعت پر شک تھا۔

"کیا کہا تم نے ؟"

"وہ ہلاک کر دیئے گئے۔"

"میری نظریں غیر ارادی طور پر راشد کے چہرے پر جمی رہیں اور زبان سے "ارے" کا ایک بے معنی لفظ جذبات کی ایک جامع آواز بن کر نکلا اور میرا منہ کئی سیکنڈ تک کھلا رہا۔ پھر میں نے خود اپنی آواز دور سے آتی ہوئی سنی۔"

"کیوں، راشد کیوں ؟"

اور اس "کیوں" کے پیچھے عروجِ انسانی کے شکوے کی ایک لمبی کہانی تھی۔

لیکن راشد کو ایسی کسی کہانی سے دلچسپی نہیں تھی اور نہ اسے اس کے متعلق سوچنے کی عادت تھی۔ اس کے لیے یہ واقعات نئے نہیں تھے مگر میری دلچسپی اس لئے زیادہ تھی کہ میں عشق و محبّت کی صحرا نوردی، بے خودی اور خودکشی وغیرہ کے بارے میں کئی داستانوں سے واقف تھا اور قاطع رحم شاہی معماروں کو جانتا تھا جو محبّت کی سانسوں کو دیواروں میں دفن کر دیتے ہیں اور ایک یا دونوں دلوں کو چبا ڈالتے ہیں اور انارکلی اور رضیہ سلطانہ کو ایک ہی معیار سے پرکھتے ہیں لیکن میں محبّت کے قانونی جرم ہونے کے بارے میں اور اس جرم کے تعزیرات کا حصّہ ہونے کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔

اور راشد کہہ رہا تھا۔

میں نے سارے واقعات محل کے ایک خادم سے سُنے۔ کمال اور جمیلہ کی معصوم دوستی کا سب کو علم تھا اور دونوں ہمیشہ کے لیے منسلک رہنے کا عزم کر چکے تھے۔ جب سامیہ کے جلنے کے بعد جمیلہ نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو اس کی سختی سے مخالفت کی گئی۔ امیرانہ روایت کے مطابق مرد عوام میں شادی کر سکتا تھا مگر عورت صرف خاندان میں بیاہی جاتی تھی۔ جمیلہ پڑھی لکھی تھی اس نے یہ معاملہ عدالت میں پیش کیا۔ روایت کے مطابق

سماعت بند کرے میں ہوئی اور عدالت نے مذہب اور قانون کی بنیاد پر جمیلہ کے حق میں فیصلہ کیا مگر یہ فیصلہ نظر انداز کر دیا گیا اور جمیلہ محل میں قید کر دی گئی۔ ایک دن ایک خادم کی مدد سے جمیلہ محل سے باہر آئی اور کمال کے ساتھ فرار ہوگئی مگر سرحد عبور کرنے سے پہلے انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ معاملہ خاندان والوں کے سامنے پیش ہوا اور جمیلہ کی ماں نے روایتی سوال کیا۔

"تم امیرہ ہو۔ ایک کامنر کے ساتھ کیسے بیاہی جا سکتی ہو؟"

جمیلہ نے مذہب، قانون اور جج کے فیصلے کا سہارا لیا۔ پھر بولی۔

"کیا یہ روایت کے خلاف نہیں کہ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک ایسے جامعہ میں بھیجا جائے جہاں مخلوط تعلیم کا رواج ہے؟"

"علم حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خاندان سے بغاوت کی جائے۔ تم شادی کے بعد محل میں کیسے رہ سکتی ہو؟"

"میں محل میں رہنے کی خواہشمند نہیں۔ بلکہ میں تو یہ ملک بھی چھوڑ دوں گی جہاں ایسی فرسودہ روایتیں زندگی کی سچائی کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔"

"تم باغی ہو اور باغی کی سزا موت ہے!"

"میں موت سے نہیں ڈرتی!"

اور پھر راشد نے خادم سے جو کچھ سُنا تھا بیان کرنا شروع کیا، لیکن میری قوّتِ سماعت جواب دے چکی تھی اور میں صرف دیکھ سکتا تھا۔ بہت دور اپنی جنینی[ف] وضع سے پہلے اُن کے گلستان سے ارضی نرگس میں گرنے کی غیر منطقی یادش، حُسن کو سات پردوں میں روپوش کرنے کی بدذوق رسم، چلتی ہوئی سانسوں کو زمین دوز کرنے کی روایت، مرد کی پسلی کی احسان مندی، حرم اور چار دیواری، کوڑے اور سنگ ساری، دیوار میں نسوانی ڈھانچا، ریگ میں پیوست بے مسالے کی ممّی، موجوں میں بہتی ہوئی مٹّی کی غدّاری،

---

ف FETUS جنین

سلطنت سے دستبرداری، پورے بدن پر عملداری اور نصف حق داری، اسٹاک مارکیٹ، بازار، آنسو، بے وفا سے وفاداری اور ترکِ موالات کی ایک طرف داری۔

اور پھر راشد کے آخری جملے کی بہت ہی ڈراؤنی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میں چونک پڑا۔

اور خادم نے کہا۔

میں نے جمیلہ کو زمین پر تڑپتے دیکھا اور کمال کی چیخ سنی اور کمال پر دو تلواروں کو گرتے اور اٹھتے دیکھا . . . .

خون کی لکیریں کمال کی رگوں سے نکل کر جمیلہ کی لاش تک بہتی نظر آرہی تھیں،

اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

بے چاری . . . .

خادم نے مجھے تعجب سے دیکھا "تم جمیلہ کو مظلوم کہتے ہو، سامیہ میں انھیں کوئی مظلوم نہیں کہتا۔ اس کے مرنے کے بعد لوگوں نے تالیاں بجائیں اور اس طرح روایت اور قانون کے احترام کا مظاہرہ کیا۔ میں بھی تالی بجانے والوں سے تھا" اور پھر میں نے تمام لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھے۔

اس واقعے کو کئی دن ہو چکے لیکن جمیلہ اور کمال کی موت کی جو تصویر راشد نے کھینچی تھی وہ مجھے ایسے معلوم ہو رہی تھی جیسے میں خود بھی جائے وقوعہ پر موجود تھا۔ آج میں پھر اسی ریستوران میں بیٹھا تھا جہاں کمال اور جمیلہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ راشد ساتھ تھا۔ میرے سامنے چائے کی پیالی تھی اور میں نے اسے اپنے ہونٹوں سے لگانا ہی چاہا تھا کہ کسی نے کہا۔

"لائٹ پلیز"

میں نے لائٹر جلاتے ہوئے کہا۔

"کمال تم ؟"

اور ساتھ ہی میری نظر جمیلہ پر پڑی جو قریب کی میز کے پاس بیٹھی تھی۔

سگریٹ جلا کر اس آدمی نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔

آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ میرا نام کمال نہیں اسماعیل ہے۔

اور وہ جمیلہ کی طرف چلا گیا۔ دونوں نے ہماری طرف دیکھا اور مسکرائے۔ پھر اٹھ کر دروازے کی طرف جانے لگے۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ کمال اور جمیلہ تھے۔ میں لپک کر اُن کے پیچھے دروازے تک گیا اور آواز دی۔

"امیرہ جمیلہ"

وہ دونوں دروازے کے باہر جا چکے تھے۔ میں نے فضا میں گھورنا شروع کیا۔ باہر چہل پہل تھی اور لوگ موسم کا لطف لے رہے تھے لیکن جمیلہ اور کمال کا کہیں پتہ نہ تھا۔

کسی نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو راشد کھڑا تھا۔ میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔

"راشد تم نے دیکھا۔ جمیلہ اور کمال"

راشد نے مجھے غور سے دیکھا

"ارے یہیں پاس والی کرسی پر بیٹھے تھے۔ کمال نے مجھ سے لائٹر مانگا اور سگریٹ جلایا۔ پھر جمیلہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ دونوں ایک ساتھ باہر نکلے اور خدا معلوم کہاں غائب ہو گئے۔

راشد نے میری چائے کی پیالی جو وہ میز پر سے اٹھا کر لایا تھا۔ میری طرف بڑھائی اور بولا۔

"لو اسے پیو۔"

○

پریمیٹو سماج اور قبائل میں شادی سے پہلے عورت کے باکرہ ہونے کو ایک بڑی اخلاقی ضرورت سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ مغربی سماج میں بھی جیسٹیٹی بلٹ کے افسانے ملتے ہیں۔ آج کل کی دنیا میں بھی عقیدہ اور تہذیب اور اعتماد اور بھروسے کا ریشنلائزیشن ہماری سوچ پر غالب ہے کیونکہ اس کے بغیر چارہ ہی کیا ہے۔ مغرب میں کشمکش اب بھی جاری ہے اور حقیقت کا احساس عقیدے اور وہم دونوں پر غالب آرہا ہے شاید پدری سماج کی بنیاد پر ضرب لگ جائے۔

# بند منہ کی سیپ اور کوآپریٹو

"کیا علم الاعداد میں اس کی کوئی حیثیت ہے؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن تمبولا کھیلتے وقت وہ لکی سیون کہا کرتا تھا۔"

"اچھا چلو دیکھتے ہیں سات سے کیا بنتا ہے؟"

"سات آسمان، ساتواں دن (سبت) اللہ نے دنیا کو چھ دن میں پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔"

"غلط۔ کرنٹ بات کرو۔ فرسودہ باتیں نہیں کرو۔"

"تم ہی بتاؤ۔"

"اللہ نے چھ دن میں زمین اور آسمان پیدا کیا۔ ثم استوی علی العرش۔ آگے چلو۔"

"سات پھیرے۔ سات طواف۔ سات مست"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"یہ نتیجہ ہے۔"

"مگر نیساں؟"

"ہاں نیساں۔ رومیوں کا ساتواں مہینہ"

"اور آبِ نیساں؟"

"ہاں موسم کی پہلی بارش"

"HOW LUCKY"

"کیوں؟"

"سیپ کا منہ کھل جاتا ہے اور موتی کا EMBRYO بننے لگتا ہے۔"

اس نے گردن نیچی کر لی۔ اور اس کا دوست بھی سمجھ گیا۔ کتنے آبِ نیساں گذر گئے مگر سیپ کا منہ نہ کھلا۔ قریب کے لوگ دو دھڑوں میں بٹ گئے تھے۔

"تخلیق کی کہانی جھوٹی ہے۔ سانپ کے اعصاب کمزور تھے۔ وہ جنّت میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔"

دوسرا کہتا تھا "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ مگر سانپ خود تو بِل نہیں بنا سکتا تھا۔ پہلے سے بنی ہوئی بِل میں گھس سکتا ہے۔ جنّت کی فصیلوں میں تو بِل ہی نہیں تھی۔"

"تم پھر آؤٹ آف ڈیٹ ہو گئے۔ سانپ اور بِل کی بات نہ کرو۔ آبِ نیساں سے ریت میں کیا اُگتا ہے۔"

دوسرے دھڑے نے کہا "آبِ نیساں برسا ہی کہاں۔ بادل آئے۔ گرجے اور سکڑ کر نیچے اُتر گئے۔"

"بادل نیچے نہیں اُترتے۔"

"کیوں نہیں، میں ہوائی جہاز سے دیکھنے کی بات کر رہا ہوں ABOVE THE CLOUDS"

"وہاں آبِ نیساں نہیں ہوتا۔"

غرض کہ دھڑوں کی باتوں کو سنتے سنتے وہ تھک گیا تھا۔ وہ کیسے بتاتا کہ جو زمین اُس نے خریدی تھی، بہت پہلے جب وہ اسٹیٹ لینڈ کہلاتی تھی، آبِ نیساں کے قطرے سے متاثر ہو چکی تھی۔ سیپ کا منہ کھلا تھا اور موتی کا EMBRYO بھی بنا تھا۔ مگر کو آپریٹو اونر شپ بنیاد تھی اور سنگل اونر شپ کا نظریہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے موتی کو اس کے پختہ ہونے سے پہلے ہی نکال لیا گیا، اور اسٹیٹ لینڈ کو اچھوت بنا کر فروخت کر دیا گیا۔ خریدار کو اس کا کوئی علم نہ تھا اور وہ لوگوں سے یہی پوچھتا تھا۔

"کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ رومیوں کے ساتویں مہینے میں آبِ نیساں برسے لیکن موتی نہ پیدا ہو؟"

"سیپ کا منہ تو ضرور کھلتا ہے۔"

"شاید آبِ نیساں کا قطرہ سیپ میں پہونچنے سے پہلے ہی اس کا منہ بند ہو گیا ہو۔"
کسی نے فلسفیانہ تشکیک کے ساتھ کہا۔

"کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔ مگر۔۔۔ کیا معلوم۔۔۔۔ کون بتائے گا؟"

"بات ہمیشہ چھپی نہیں رہتی۔ بلکہ کبھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ خصوصاً اس ترقی یافتہ زمانے میں جب کہ کمیونیکیشن کے ذرائع اتنے وسیع ہیں۔ ریڈیو۔ ٹی وی۔ بگڈ ٹرانسمیٹر۔ بگڈ ٹیلیفون۔ بگڈ آدمی۔۔۔۔"

"لیکن یہ سب کسی بگڈ ڈیوائس سے تو نہیں معلوم ہوا۔ اس نے دھمکی بھی دی تھی اور کہہ دیا تھا کہ نیچرل INSEMINATION کا قصہ سب کو بتا دے گی۔ دھڑے میں کسی کے ٹوٹتے کتنی دیر لگتی ہے۔ گرمی۔ مرچ مسالے۔ آم اچار سبھی تو گرمی پیدا کرتے ہیں اور خون بھی پتلا ہوتا ہے۔ گرم ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اس پار یا اس پار۔۔۔۔ اور رشتہ؟ کیسا رشتہ؟ ارے بھائی یہ ممانی کا رشتہ کوئی رشتہ ہوتا ہے۔ بہت سے مصنوعی رشتے ہوتے ہیں۔ ان لکھی روایت سماجی وضع داری اور یہ سب کو سمس کا حصہ تو ہیں نہیں کہ آربٹ سے ہٹیں تو قیامت آجائے گی۔"

"لیکن بات کیا تھی؟"

"بس وہی لینڈ اونر شپ۔"

"اس کی اپنی؟"

"نہیں جی۔ اولاد کی۔ یہ سارا کھیل تو اولاد ہی کا ہے۔ کوآپریٹوز کا وارث کون؟ ورنہ یہ جھگڑے کہاں ہوتے ہیں۔"

"اور فاتحہ اور حلوہ؟"

"ہاں۔ وہ بھی۔ کون مرنا چاہتا ہے۔ سالا کا کروچ کیسے آئے گا فرشتوں کی موجودگی میں۔"

"اور کتا کوهب اور اہرام مصر"

"اب حال کہاں ہے؛ ورنہ پروہتوں کے ساتھ دفنائے جاتے۔"

"کفن گھسوٹ بھی تو زیادہ ہیں۔"

وہ تو ہمیشہ تھے ورنہ فراعنہ کی سیکرٹ چیمبر کی کیا ضرورت تھی۔ مگر کفن گھسیٹوں نے چھوڑا پھر بھی نہیں۔ تین ہزار سال بعد سہی مگر ہاتھ صاف کر گئے۔

"کہاں بہک گئے یار۔ بات تو کمیونیکیشن کی ہو رہی تھی۔"

"ہاں تو ایک دھڑے میں کوئی گرم ہو گیا اور اس نے کہا میں تباہ کر دوں گا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟ بتا دیا کہ سیپ کا منہ کھل چکا تھا اور اُسے کھرچ کر صاف کر دیا گیا تھا۔ اب ہزاروں آب نیساں اس میں موتی کا EMBRYO پیدا نہیں کر سکتے۔"

"یقین آگیا اسے؟"

"شاید نہیں۔ لیکن اس نے خود بتایا۔"

"سب کچھ۔ اور یہ بھی کہ وہ کوآپریشوز کے حکم کے تابع ہے اور سپردگی کی رسم کا احترام ضروری ہے۔ لیکن کھلونے میں چابی بھرنے والے عدد ختم ہو چکے اور وہاں اس کا وجود کوسوں دور رہوتا ہے۔ ماضی میں جو بالکل تاریک ہو چکا ہے اور روشن نہیں ہو سکتا۔"

"مگر حال؟"

"وہ بھی روشن نہیں ہو سکتا کیوں کہ جو حال میں ہوتا ہے وہ، وہ نہیں ہوتا جس میں حیات اور حرارت ہو۔"

"تو یہی سوچ لیا کرے کہ ماضی لوٹ آیا ہے اور یہ وہی آب نیساں ہے۔ جس کا قطرہ پہلی بار سیپ کے منہ میں گیا تھا۔"

"یہ تو اس وقت ہوتا ہے جب وہ حال میں ہو اور دور ہو مگر دل اور دماغ سے قریب ہو۔"

"تو دوری کیسے؟"

"کیوں نہیں بھئی۔ تم لکیر کے فقیر ہو۔ نہ علم الاعداد کے بارے میں جانتے ہو اور نہ روحانی کمیونیکیشن کے۔ بھاگو یہاں سے۔"

# اَلیمنی

اس نے لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کی پندرہ سال کی بچّی کھڑی تھی۔ بچّی کو دیکھتے ہی وہ جذباتی ہوگیا۔ اس نے بڑھ کر اُسے پیار کرنا چاہا مگر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور ساتھ ہی ایک کاغذ کا ٹکڑا اس کی طرف بڑھایا۔

"آؤ، اندر آجاؤ"

"نہیں مجھے فوراً جانا ہے۔ فاؤسٹ اور میری ممّی کار میں میرا انتظار کر رہے ہیں"

وہ خاموش ہوگیا۔ اُسے معلوم تھا کہ فاؤسٹ اس کی مطلقہ بیوی کے ساتھ رہتا ہے اور اُس کے بچّوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ وہ فاؤسٹ کو اچھّی طرح جانتا تھا، کیوں کہ دونوں پبلشنگ کے ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔

اُس نے کاغذ کو غور سے پڑھا۔ پورے مہینے کا حساب تھا۔ اُس کے دو بچّوں کی تعلیم، گھر کا خرچ جس کے کم یا زیادہ کرنے میں اُسے کوئی دخل نہیں تھا۔ اپارٹمنٹ کا کرایہ اور آخر میں بقایاجات کا ذکر تھا جو اس نے کئی ماہ سے ادا نہیں کیے تھے۔

اُس نے چیک بک نکالی۔ کاؤنٹر فوائل پر بیلنس دیکھا اور چیک لکھ کر باہر آیا۔ مسکرا کر اپنی بیٹی کو دیکھا اور چیک اُس کے حوالے کر دیا۔ لڑکی نے چیک لے لیا اور بولی۔ ممّی نے کہا تھا کہ اس بار تمام بقایاجات کلیئر ہوجانے چاہئیں ورنہ فاؤسٹ کورٹ سے نوٹس لے کر آجائیں گے۔ اُس نے پیار سے اپنی بیٹی کو دیکھا اور مسکرایا مگر بیٹی کے چہرے پر کوئی تاثر نہ

دیکھ کر اُس کی مسکراہٹ افسردگی میں بدل گئی۔ لڑکی بے اعتنائی سے مڑی اور کار کی جانب چلی گئی جو کچھ فاصلے پر کھڑی تھی اور جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر اس کی ماں اور برابر کی سیٹ پر فاؤسٹ بیٹھے تھے۔

"اُس نے پورے پیسے نہیں دیئے"

"کہاں سے دے گا؟"

"مگر عدالت نے فیصلہ دے دیا ہے"

"وہ اس لئے کہ ہم نے اُس کے اسٹیٹس کو بہت زیادہ بتایا۔

"اُسے چیلنج کرنا چاہیے تھا۔ اُس نے وکیل تک کو مقرر کرنا ضروری نہ سمجھا HOW PROUD

"یہ اُس کا پرائڈ نہیں تھا۔ اُس کی شرافت تھی۔ اُس نے تو یہی کہا تھا کہ میرے اسٹیٹس کے بارے میں میری بیوی نے جو دستاویز پیش کی وہ ٹھیک ہوگی کیونکہ اُس کے بارے میں وہ بہتر جانتی ہے۔ میں تو ایک رائٹر ہوں۔ مجھے ان سب معاملات میں دخل دینے کی فرصت کہاں تھی؟"

"اور بیوی کے معاملات میں دخل دینے کی فرصت تھی؟"

وہ بھی نہیں تھی۔ اُس نے تو ہم دونوں کو COMPROMISING POSITION میں دیکھ لیا تھا۔ بس ضرورت سے زیادہ شریف تھا۔" یعنی بے وقوف" اُس کی مطلقہ بیوی اور فاؤسٹ نے قہقہہ لگایا۔

اُس کی بیٹی نے فاؤسٹ کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ لیکن یہ مسکراہٹ ان کے قہقہے میں شمولیت نہ تھی بلکہ کسی اور خاموش گفتگو کا اشارہ تھی اور وہ لکھ رہا تھا۔

"مادری سماج کب تھا اور کب تک تھا۔ اس کا تعین مشکل ہے لیکن انسانی تاریخ کے آغاز کے بعد اور زمین پر غلّہ اُگا کر اور گھروندا بنا کر رہنے کے بعد بہت دن تک عورتوں کی حکمرانی تھی۔ بچّے اس ماں کے ہوتے تھے جو انھیں جنم دیتی تھی۔ اس میں باپ کی شرکت نہیں تھی کیوں کہ باپ ایک اوزار تھا جو ایک جگہ نہیں رہتا تھا۔ اس کا کام بیج بونا تھا اور بس۔ اس کا دعویٰ نہ پیداوار پر تھا اور نہ کوئی ذمّے داری اُس کے تطور کی۔ VULVOCENTRISM یہ

معاشرے کی بنیاد قائم تھی۔

کسی خیال کے تحت وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور شاپن ہاور کا مضمون پڑھنے لگا۔

"مرد ہی ایسا ہے جس کی عقل پر جنسی خواہش کا جذبہ ہوتا ہے کہ وہ خوب صورت جنس (FAIR SEX) کا نام اس پستہ قد، چھوٹے کاندھوں، چوڑے کولھوں اور چھوٹی ٹانگوں والی نسل کو دیتا ہے۔ اس لیے کہ جنس کی ساری خوب صورتی خود اس کی خواہش کی گرفت میں ہوتی ہے۔ بجائے خوب صورت کہنے کے عورتوں کو "غیر جمالیاتی جنس" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔"

وہ زیرِ لب مسکرایا۔ پھر سامنے دیکھا۔ مینٹل پیس پر اس کی بیوی کی تصویر سفید ویڈنگ گاؤن میں اُس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اُس کی زبان سے بے اختیار نکلا HOW CYNICAL

اور اس نے ایک اور ورق اُلٹا۔

"ایشیائی اسے بہتر سمجھتے ہیں، اور بلا تکلف عورتوں کی کمتری کو تسلیم کرتے ہیں۔ جب قانون نے عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دئے تو انھیں عورتوں میں مردانہ دانشوری بھی پیدا کرنی چاہئے تھی۔ ازدواجی تعلقات کے ضمن میں ایشیائی ہم سے بہتر دیانت داری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہاں ایک سے زیادہ ازدواجی ساتھیوں کی موجودگی کو قانوناً جائز سمجھا جاتا ہے۔ جو ہمارے ہاں کثرت سے عملی طور پر رائج ہے مگر اسے لفظوں کے انجیر کے پتے میں لپیٹا جاتا ہے۔ حقیقت میں ایک پر اکتفا کرنے والے کہاں ہیں؟"

دوسرا ورق:

"ہمارے حق میں یہی بہتر ہے کہ ہم عورتوں سے کم سے کم واسطہ
رکھیں۔ عورتیں ایسی برائی بھی نہیں جو ہماری ضرورت ہیں۔
اُن کے بغیر ہماری زندگی زیادہ محفوظ اور زیادہ آسان
ہوتی ہے۔ مردوں کو چاہیئے کہ وہ عورتوں کے حُسن کے جال
سے بچیں اور تخلیق مکرّر کا سوانگ خود بخود ختم ہو جائے گا۔"

جب سے عورتوں کی آزادی اور PHALOCENTRISM کے خلاف نسوانی تنقید
نے ایک تحریک کی صورت اختیار کرلی تھی اس نے اُس تحریک کے فروغ کے لیے بہت کچھ لکھا
تھا لیکن آج ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے تمام مفروضات اور تصوّرات کو ڈی کنز کٹ
کر رہا ہے۔ اُس نے اپنا پرانا مضمون نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔

"پدری سماج کے وجود میں آنے اور مرد اور عورت کے ازدواجی
تعلّقات قائم کرنے کے بعد عورت ایک کمزور جنس سمجھی
جانے لگی۔ اس کا کام گھر گرہستی اور بچّوں کی نگہداشت
ہو گیا اور مادری سماج کے زمانے میں جس طرح مرد ایک
پیداواری اوزار تھا اسی طرح عورت ایک پیداواری
اوزار بن گئی اور بچّے باپ کے ہو گئے۔"

ایڈیٹر نے یہ جملہ پڑھا تو اسے ایک شرارت سوجھی۔

"تم کس سماج میں رہ رہے ہو۔ مادری یا پدری؟"

"آپ ایسا سوال پوچھ رہے ہیں جس کا جواب میرا مضمون پڑھ کر ایک بچّہ بھی
دے سکتا ہے۔"

"ہاں۔ یعنی ہم سب پدری سماج کے آدمی ہیں۔ لیکن تمہارے بچّے تو تمہیں گھاس نہیں
ڈالتے۔ وہ تو اپنی ماں کے بچّے ہیں۔"

"میں آپ کی بات سمجھ گیا۔ ابھی مضمون نامکمل ہے۔"

اور اُس نے پھر لکھنا شروع کیا۔

"شاپن ہاور نے ٹھیک کہا تھا کہ MONOGAMY محض ایک غلط اصطلاح ہے۔ کوئی صرف ایک سے جنسی تعلقات رکھنے پر اکتفا نہیں کرتا۔ مشرق نے اس مسئلے کو سمجھا تھا اور اسی لیے وہاں ایک مرد کی کئی بیویاں ہو سکتی ہیں۔ پرانے ہندو سماج میں تو ایک عورت کے بھی کئی شوہر ہو سکتے تھے۔ مہابھارت میں دروپدی پانچ بھائیوں کی بیوی تھی۔ اگر کوئی ایسا رواج رہا بھی ہو گا تو بہت جلد اس بنا پر دبا دیا گیا ہو گا کہ نسل کو باپ سے منسوب کیا جانے لگا جو پدری سماج کی صفت ہے اور باپ کی شناخت کے لیے شاید عورتوں کا کئی مردوں کی بیوی ہونا متروک ہو گیا۔ لیکن مرد کو اپنے پاس یہ حق رکھنا اور عورت کو اس سے محروم کرنا پدری سماج میں عورت کا استحصال تھا۔ مغرب میں مرد اور عورت دونوں کو بڑی حد تک برابری کا درجہ دیا گیا۔ اسی لیے دونوں کا MONOGAMOUS رہنا ضروری قرار پایا۔ بڑی حد تک لوگ ..... " اُس نے یہ جملہ قلم زد کر دیا اور پھر لکھا، بڑی حد تک کچھ لوگ ..... " اُس نے یہ جملہ بھی قلم زد کر دیا، اور آگے کچھ نہ لکھ سکا، بلکہ سوچتا رہا۔

"لیکن مَیں نے تو اُس کی پابندی کی تھی اور شاپن ہاور کو غلط ثابت کر سکتا تھا۔ مگر ... جانے کب سے ... بچے تو اپنے ہی ہیں ... ہاں یاد آیا دوسرے بچے کے پیدا ہونے کے بعد ... نہیں نہیں پیٹ میں آنے کے بعد ... مگر وہ اجنبی تو نہیں تھا ... ہاں مگر اتنا قریبی بھی نہیں ہوا تھا ... ویسے میں کیا کہتا۔ فاؤسٹ ... نہیں نہیں اس سے پہلے نہیں ... ثابت کیا کرنا چاہتے ہو ..... یہ تو ناممکن ہے ... اور اب کیا فائدہ ... اب تو کوئی تم کو باپ سمجھتا ہی نہیں ... اس میں ان معصوموں کا کیا قصور ... پھر بھی معاہدے کے ٹوٹنے کے وقت کا تعین ممکن ہی نہیں ... مگر مَیں ... مَیں نے تو کبھی ... یا شاید وقت ہی نہ تھا ... یا شاید مجھے سب کچھ مل جاتا تھا ... اس سے کہیں زیادہ کی تمنّا تھی ... کیا یہ میرا استحصال نہ تھا کیسے لکھوں کہ پدری سماج میں عورتوں کا استحصال ہوتا ہے۔ استحصال تو میرا ہوا اور ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا، عورت کے ہاتھوں LIB اور نسوانی تنقید بے بنیاد ہے ... قانون؟ اس لیے کہ

سماج کے لئے کسی باپ اور کسی کی اولاد ہونا ضروری ہے . . . . اور اسی لئے ADULTERY جرم ہے ۔ مگر میں ثابت کیسے کرتا ۔ میری مشرقی سوچ غالب آگئی ۔ ایک عرصے سے مغرب میں رہتے ہوئے بھی میں زندہ مکھی نگلنے کا عادی نہیں ہوا تھا ۔ یہ میری وفاداری اور شرافت اور اچھا شہری ہونے کی صفات کو چیلنج تھا . . . . . اور یہ ڈرامہ کب شروع ہوا مجھے نہیں معلوم . . . اور میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور فاؤسٹ تو ہماری نسل کے بعد والی نسل سے تعلق رکھتا تھا ۔ وہ جب کاؤنٹی کے رجسٹر میں داخل ہوا تو میں دس سال سے ازدواجی رشتوں میں بندھا ہوا تھا . . . شاید یہی وجہ ہے . . . چالیسویں مائل اسٹون پر مرد اور عورت دونوں کینچلی اتارنا چاہتے ہیں . . . پر میں تو . . . معلوم نہیں کیوں ؟ شاید میں بزدل تھا ۔ شاید مجھ میں تجدید کا جذبہ تھا ہی نہیں ۔ شاید میں دھوپ میں زیادہ رہا تھا . . . شاید میں نے جلدی کی ۔ لیکن نہیں . . . میں اور میری سوچ . . . . MISFIT . . . . اسی لئے میں نے جلدی کی . . . طلاق دے دی . . . دفاع ؟ کیا دفاع کرتا . . . نتیجہ وہی تھا . . . مگر اس عذاب سے تو بچ سکتا تھا . . . بس یہاں بھی مشرق کی شرم و حیا غالب آئی . . . اور میں اپنے بچوں کو اپنے سے جدا نہ کرنا چاہتا تھا . . . مگر وہ گئے تو بس گئے . . . مجھے پہچانتے نہیں . . . صرف یہ جانتے ہیں کہ میں مقروض ہوں . . . ان کی ماں کا . . . جس کا میں نے ان کی لقر میں استحصال کیا . . . شادی ؟ اب کیا ضرورت ہے اسے . . . اُلیمنی مل جاتی ہے اور وہ بھی مل جاتا ہے جس کے لیے شادی ہوتی ہے ۔ لیکن شاید امید سے زیادہ . . . مگر میری بیٹی . . . کس کی بیٹی . . . وہ تو . . خیر . . فاؤسٹ . . . نہیں نہیں . . . ہاں ہاں . . . اس سماج میں سب کچھ ممکن ہے . . . . دو تین سال ہی تو باقی ہیں . . . کنسینٹ کے اٹھارہ سال ہونا ضروری ہے . . . اٹھارہ سال . . . ہر چیز دکھاوا ، منافقت ، قانون کچھ ، عمل کچھ ، آزادی ، آزادی . . . پھر قانون کیوں ؟

اور وہ ایک دم سے چونک پڑا ۔ ریجنٹ پارک کی جھیل سے مرغاب کا جوڑا ایک ساتھ اڑا اور دور کنارے پر ایک ساتھ بیٹھ گیا اور اُسے یاد آیا ۔ اس کی ماں کہا کرتی تھی

کے پاس ہی سر پٹک پٹک کر مر جاتا ہے۔ وہ مسکرایا، اور بہت ہی دھیمی آواز میں بولا . . . .
جبلت، نان سنس . . . . کس نے دیکھا کہ پارٹنرز وہی تھے اور بدلے نہیں تھے۔ مگر یہ کوئی ریسرچ کا موضوع نہیں ہو سکتا کیوں کہ اگر یہ جبلت ہے تو منطق تو بہت آگے کی بات ہے۔ انسان تو پارٹنرز کی زندگی میں سر پٹکتا ہے۔ ایک پارٹنر کی موت کے بعد تو دوسرے کو زندگی مل جاتی ہے شاید یہ اس زمانے کی بات ہے جب پارٹنرز نے ایک دوسرے پر قبضہ کرنا ضروری سمجھا اور معاشرے کا جبر شخصی آزادی پر غالب آگیا۔

اور پھر اُسے نیند آ گئی۔ وہ اس وقت جاگا جب دروازے پر دستک ہوئی۔

"راکی تم!" اور پھر وہ مسکرایا۔ راکی کچھ کہے بغیر اندر آگیا اور رائیمنی کا بل اُس کی طرف بڑھا دیا۔

"اس بار کم ہیں۔ بقایا ایڈجسٹ کر دیا گیا ہے۔"

"کیوں؟"

"اب صرف ممی اور میں رہ گئے ہیں۔ بہنی چلی گئی۔"

"کہاں چلی گئی؟" اُس کے لہجے میں فکر مندی تھی۔

"اُس نے شادی کر لی۔ فاؤسٹ کے ساتھ"

"فاؤسٹ کے ساتھ؟ . . . . . وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر اس کے بیٹے نے سوال پہلے کیا۔

"آپ چیک ابھی دے رہے ہیں یا میں پھر آؤں۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے اپنی میز کی دراز سے چیک بک نکالی اور چیک لکھ کر راکی کے حوالے کر دیا۔

اُسی دن اُس نے اپنی ڈائری میں لکھا۔

"فاؤسٹ نے ایمنی ختم ہونے کی رہی سہی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔"

⊙

امید اور بے یقینی ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ بے یقینی نہ ہو تو امید بھی بے معنی ہے تہذیب کا ارتقاء ہمیں دوسروں پر انحصار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور غیر یقینی احساس کو تقویت عطا کرتا ہے۔ ہم "کب" پر زندہ ہیں۔ ہمیں اگر یقین بھی ہے کہ کیا ہوگا" تب بھی کب ہوگا؟" ہماری روزمرّہ کی زندگی کے نصاب کو مشکل بناتا رہتا ہے۔

# جدلیاتی وجود

اُس کو یہی فکر تھی کہ سورج کب نکلے گا، بادل کب آئیں گے، بارش کب ہوگی، بیج کب اُگے گا، پودا کب بڑھے گا، آم کب بورے گا . . . . بس ان باتوں کے بارے میں سوچتے ہوئے اور اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے اور خود ہی جواب دیتے ہوئے اسے ایک بات کا کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کوئی ہنس نہ دے، اور جب پیچھی مارے موتج کی چٹائی پر بیٹھا ہوا شخص زور سے ہنسا تو وہ ایک دم خاموش ہوگیا۔ لیکن یہ شاک زیادہ دیر نہ رہ سکا۔ اُس نے مڑ کر ہنسنے والے کی طرف دیکھا اور قدرے تعجب سے کہا۔

"تم ؟"

"ہاں۔ میں"

"کب آئے ؟"

"میں تو بڑی دیر سے یہاں بیٹھا ہوں"

وہ خاموش ہوگیا۔ لیکن وہ دوسرا کچھ دیر تک منتظر رہا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ وہ اپنی خود کلامی کی دلیل دے گا اور اپنی جھینپ مٹانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن جب وہ کچھ نہ بولا تو موتج کی چٹائی والے نے خود ہی سوال کیا۔

"یہ تم نے سورج اور بادل اور بارش اور بیج اور بور کی کیا رٹ لگا رکھی ہے ؟"

"میں تو جواب بھی دیتا جا رہا تھا۔ تم نے وہ نہیں سنا"

"وہ کیسے سنتا۔ جب تم اپنے آپ سے بولتے ہو تو آواز اتنی آہستہ ہو جاتی ہے کہ

قریب بیٹھا ہوا آدمی تو کچھ سن ہی نہیں سکتا۔"

"تو اپنے آپ سے بولتے وقت آواز اونچی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"کبھی آواز اونچی کر لی گیا، بولنے کی بھی ضرورت نہیں، لیکن تم بول رہے تھے اور پھر ہر سوال کا جواب دے رہے تھے جیسے تم کسی پاس بیٹھے ہوئے سے بات کر رہے تھے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن جو میں بول رہا تھا مجھے وہ بھی ٹھیک طرح یاد نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اور سوچ رہا تھا اور بول رہا تھا اور میں وہاں موجود نہیں تھا۔"

"چلو یہی سہی۔ میں یاد دلاتا ہوں۔ تم کہہ رہے تھے، سورج کب نکلے گا، بادل کب آئیں گے، بارش کب ہوگی، بیج کب آئے گا، پودا کب بڑھے گا، آم کب بورے گا وغیرہ۔ یاد آیا؟"

"ہاں یاد آ گیا۔ اس نے مجھ سے یہی سوال کیے تھے۔"

"کس نے؟ وہ تو تم خود بول رہے تھے۔"

"شاید خود بول رہا تھا۔ مگر وہ خود بھی مجھ میں نہیں تھا۔"

"اچھا فلسفہ نہ بگھارو۔ یہ بتاؤ کہ ان سوالوں کے جواب کیا تھے؟"

ادرامس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ جیسے اُسے بلا رہا ہو، جو ان سوالوں کا جواب دے، اور پھر کہنے لگا۔

"ہم سب موسم کے جبر کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ جب سورج نکلتا ہے تو روشنی ہوتی ہے۔ بارش ہوتی ہے تو پانی ملتا ہے۔ فصلیں اُگتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔"

لیکن ہم نے اندھیروں کو فتح کیا، بادل بنائے، پانی کو مقید کیا اور اس کا راستہ متعین کیا، زرخیزی کی کلید تیار کی۔"

وہ پھر خاموش ہو گیا اور کافی دیر تک خاموش رہا۔ اس لئے نہیں کہ اُس کے خیالوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اس کی چھوٹی بیٹی ہاتھ میں شمع لیے داخل ہوئی تھی اور پوچھ رہی تھی۔

"روشنی کب آئے گی؟"

اور وہ اسے جواب دینے کے بجائے پیار کر رہا تھا، اور جو مونج کی چٹائی پر بیٹھا تھا۔
جواب دے رہا تھا۔

"کیا بھروسا؟"

اور بچّی نے کہا۔

"ٹیلیفون کیجیے نا"

وہ مسکرایا اور وہ دوسرا جو مونج کی چٹائی پر بیٹھا تھا، زور سے ہنسا اور بولا۔
"ٹیلیفون کرتے وقت تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ کوئی سننے والا ہوگا اور جب کوئی سننے والا نہیں تو ٹیلیفون کیسے کیا جائے؟"

لیکن وہ جانتا تھا کہ مونج کی چٹائی والے کی باتیں بچّی کی سمجھ میں نہیں آسکتیں، اُس نے کہا،

"بیٹی ٹیلیفون تو بہت لوگ کرتے ہیں۔ پھر وہ جواب دیتے دیتے تھک جاتے ہیں، اور جواب ایک ہی ہوتا ہے اور پھر وہ بالکل لاجواب ہو جاتے ہیں اور ٹیلیفون کا وہ بٹن دبا دیتے ہیں جو انھیں ہمیشہ کے لیے مشغول کر دیتا ہے اور پھر وہ بھی سونے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ جب کوئی جواب ہی نہیں تو ٹیلیفون کرنے سے کیا فائدہ؟"

لیکن بچّی اتنی لمبی بات کی متحمّل کب ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی شمع لئے واپس چلی گئی اور اس کی آدھی بات اِسی طرح جاری رہی جیسے وہ خود سے یا اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے "خود" سے کہہ رہا ہو۔

اور پھر مونج کی چٹائی پر بیٹھے ہوئے اُس نے اپنا دو بینڈ کا ریڈیو آن کر دیا، موسم کا حال نشر ہو رہا تھا۔

شمالی اور مغربی علاقے میں گھرے بادل دکھائی دے رہے ہیں۔ جنوب میں تیز ہوائیں چلنے اور ہلکی بارش ہونے کی امید ہے۔ ہوا کا دباؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور مونج کی چٹائی والے نے ریڈیو بند کر دیا اور اُٹھ کر اُس کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا۔

وہ سنا تم نے۔ ان کو فطرت پر قابو نہیں ہے۔ یہ موسم کے جبر کا شکار ہیں مگر موسم کے

نظم اور تواتر سے آنے جانے کے بارے میں جانتے ہیں اور ان کی ساٹھ فیصد پیشین گوئیاں صحیح ہوتی ہیں۔"

"لیکن سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کی پیشین گوئی تو نہیں ہوتی۔"

"نہیں۔ یہ تو صرف آن آف ہے۔"

"اور ہماری روشنی آن آف کے تابع نہیں ہے"

"ہے۔ مگر آن آف کرنے کے لئے جس ہاتھ کی ضرورت ہے وہ کسی اور کے تابع ہے، اور وہ کسی اور کے، اور وہ کسی اور کے . . . ."

اور صبح ہو گئی . . . . لڑکی دوڑی ہوئی آئی۔ اب اس کے ہاتھ میں شمع نہ تھی کیوں کہ فطرت نے اجالا کر دیا تھا، لیکن اس کے ہاتھ میں پنکھا تھا۔ پنکھا اس لئے کہ جہاں وہ رہتی تھی، چاروں طرف اونچی دیواریں تھیں جو ہوا کو اندر نہیں آنے دیتی تھیں۔

"ہوا بند ہے۔" موسم کی چٹائی والے نے جو اب چارپائی پر بیٹھا تھا پنکھے کی دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔

"ہوا بند نہیں ہوتی۔ ہم بند ہو جاتے ہیں اور ہوا کو اندر نہیں آنے دیتے۔

"پھر کیا کریں؟" موسم کی چٹائی والے نے کہا۔

"ہاں، سیکیورٹی کے لیے دیواریں ضروری ہیں۔"

"MINIMUM SECURITY کے لئے کیوں کہ سوائے ٹی ٹی اور کلاشنکوف کے کچھ بھی سیکیور نہیں ہے۔"

"وہ بھی کہاں سیکیور ہیں۔ بم اور روکٹ لانچر اور شاید میزائل۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔ مگر در و دیوار کیوں"

"بس در سر کو چھپانے کے لئے۔"

"یہ سر" تم نے METONYM کے طور پر استعمال کیا ہے۔"

"ہاں۔"

"اور دیوار"

"وار سے بچنے کے لیے۔ آنکھوں کے وار سے۔"

اور لڑکی کی آواز آئی "بابا پانی نہیں ہے"

اور مونج کی چٹائی والا چارپائی سے اُتر کر پھر چٹائی پر بیٹھ گیا، اور اُسے اس کی بات یاد آنے لگی "بادل کب آئیں گے، بارش کب ہوگی؟"

وہ جلدی جلدی بولنے لگا۔ جیسے کسی نے اس سے کوئی سوال کر دیا ہو۔ سوال پوچھنے والا کہیں دکھائی نہیں دے رہا اور بغیر کسی محرک کے جواب کے کلمات اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ اسی لیئے میں نے کرسی اور صوفہ اور مسہری تج دی اور مونج کی چٹائی کو ترجیح دیتا ہوں۔ یہ پورٹیبل ہے۔ نیچے سے ٹھنڈی ہوتی ہے۔ اس پر لیٹنے والے کی پیٹھ اور ریڑھ محفوظ رہتے ہیں۔ اس پر بستر کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس پر پانی جذب نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ ہمیشہ پاک رہتی ہے۔

اور لڑکی کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔

"بابا پانی کب ملے گا"

وہ جواب دے رہا تھا، اس کے لب ہل رہے تھے لیکن پیرول ممکن نہ تھا اس لئے کوئی دال کسی مدلول کو متحرک نہیں کر رہا تھا۔ لیکن وہ کہے جا رہا تھا۔

"بادل آئیں گے، بارش ہوگی۔"

"دریاؤں اور نہروں کے شگاف پُر کیے جائیں گے۔"

"پمپ میں بجلی دوڑائی جائے گی"

"گرمی کم ہوگی۔"

"پہاڑوں پر برف پگھلے گی۔"

"اور پھر بیٹے اور بیٹیاں بڑے ہوں گے۔"

"یہ تم آئیڈیل کی بات کر رہے ہو یا پریکٹیکل کی؟" چٹائی پر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"میں EXISTENCE اور TEMPORALITY کی بات کر رہا ہوں"

"اور آئندہ کی"

"ہاں آئندہ کی جو ابھی نہیں ہے۔"

"اور ماضی؟"

"وہ نہیں ہے۔ گزر گیا اور اس کی یاد باقی ہے مگر وہ معیار نہیں ہے۔"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ صراحی اور گھڑا اور لالٹین اب نہیں لوٹ سکتے۔"

"لیکن EXPLOSION؟"

"ہاں۔ وہ ہو سکتا ہے اور پھر ہم وہاں سے شروع کریں گے جہاں سے ہمارے آبا و اجداد نے شروع کیا تھا"

"غلط، ہم ختم ہو جائیں گے مگر وہاں سے شروع نہیں کر سکتے۔"

"آؤ پھر امید کریں کہ سورج وقت پر نکلے گا، بادل موسم سے آئے گا، ہوا تواتر سے چلے گی، بیج اُگیں گے، پودے بڑھیں گے۔ کم سے کم ان کا ہونا یا نہ ہونا ہماری دسترس سے باہر ہوگا، اور ہم ان مصنوعی ترقی یافتہ ہاتھوں پر بھروسا نہ کریں گے۔"

ہاں ایک ہاتھ، اس کے اوپر دوسرا ہاتھ، اس کے اوپر دوسرا ہاتھ، اس کے اوپر نیند یا اندھیرا یا BAD FAITH

لڑکی کی آواز "بابا روشنی آگئی، پانی آگیا"

اُس نے اپنی مونج کی چٹائی اٹھائی اور لپیٹ کر درخت کے سہارے رکھ دی، اُس دوسرے نے اپنی چارپائی کھڑی کی اور درخت کے تنے سے لگا دی۔

دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ دونوں کو احساس ہوا کہ وہ زندہ ہیں۔

ایک نے کہا "کب تک؟"

"جب تک روشنی ہے۔"

"کون جانے"

"اور پانی؟"

وہ خاموش ہو گیا اور کوئی جواب ممکن بھی نہ تھا۔ اکیسویں صدی کے ترقی یافتہ شہر میں ٹی وی پر سٹیلائٹ سے پروگرام نشر ہو رہا تھا مگر لوگ پہلے سے تھے اور ٹی وی VOLTAGE FLUCTUATION کی وجہ سے بار بار بند ہو کر انھیں احساس دلا رہا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہیں۔

# علاج بالالفاظ

یوں تو یہ کوئی نئی بیماری نہیں تھی۔ بلکہ پہلے تو یہ بیماری سمجھی ہی نہیں جاتی تھی۔ اسے زندگی کا معمول سمجھ لیا گیا تھا، اور اس کے بہت سے نام رکھے گئے تھے، اور سب نے اس بیماری کے ساتھ زندہ رہنا اور نسل در نسل اپنی عمریں گزارنا سیکھ لیا تھا۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ بیماری تشویش کا باعث تھی کیونکہ ان کا خون بہتا رہتا تھا اور وہ دُبلے ہو جاتے تھے۔ کچھ لوگوں پر اس کا بالکل الٹا اثر ہوتا تھا۔ وہ بظاہر موٹے ہوتے جاتے تھے لیکن اندر سے ان کا جسم کھوکھلا ہوتا جاتا تھا۔ مگر اشتہا بڑھتی جاتی تھی اور یونانی اسطورتی کردار ایری شستن ERYSICHTHON کی طرح وہ ہر دم بھوکے رہتے تھے۔

ڈاکٹروں نے آپس میں مشورہ کیا اور سب سے پہلے یہ اندازہ لگایا گیا کہ شاید یہ بیماری نفسیاتی ہے اور اس کا علاج سولوتھراپی SOULOTHERAPY تجویز کیا گیا۔ ایک ڈاکٹر نے کہا۔

" ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ہماری روحیں پہلے سے اللہ کے یہاں موجود ہوتی ہیں اور اسی اسٹاک پائل سے زمین پر بھیجی جاتی ہیں تاکہ وہ امتحان دے سکیں۔ ظاہر ہے کہ ہم اس نفسیاتی بیماری کا علاج اپنی روحوں کو یہ یاد دلا کر کر سکتے ہیں کہ وہ جہاں سے آئی ہیں وہیں جانا ہے۔"

دوسرے ڈاکٹر نے کہا ہم SOULOTHERAPY کے بجائے PSYCHOTHERAPY کے اڈے میں جمع بیماری کے جراثیم کو تحلیل کے ذریعے انھیں دکھا سکیں گے۔ اپنے جراثیم کی موجودگی انھیں اپنی بیماری کے سبب سے آگاہ کر دے گی اور وہ اچھے ہو جائیں گے۔

تیسرے ڈاکٹر نے کہا۔" میرا خیال ہے کہ یہ بیماری نفسیاتی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد ضرورت پر ہے۔ ہم اسے ایک طرح کی وٹامین ڈیفیشنسی (VITAMIN DEFICIENCY) کہہ سکتے ہیں۔ جب ضرورت پوری نہیں ہوتی تو یہ جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں اور خالی جگہوں کو پُر کرنے لگتے ہیں۔ ضرورت بڑھتی جاتی ہے اور جراثیم کے لیے جگہیں خالی ہوتی جاتی ہیں۔ اگر ضرورت پوری کر دی جائے تو یہ بیماری ختم ہو جائے گی۔

چوتھے ڈاکٹر نے اس رائے سے اختلاف کیا:" ضرورت جراثیم پیدا نہیں کرتی بلکہ جراثیم حملہ آور ہوتے ہیں تو ضرورت اور اشتہا میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ضرورت کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس میں PLASTICITY اور ELASTICITY دونوں صفات ہوتی ہیں۔

تیسرا ڈاکٹر: تو کیا آپ نہیں مانتے کہ MINIMUM تکلیف دہ ہوتا ہے؟

چوتھا ڈاکٹر: مانتا ہوں مگر میکسیمم اسی وقت کارآمد ہو سکتا ہے جب وہ جسم کے ڈیفنس میکنیزم کو ختم نہ کر دے۔

تیسرا ڈاکٹر: آپ کا مطلب یہ ہے کہ IMMUNITY ہو جائے تو ڈوز اور POTENCY بڑھانا پڑتا ہے۔

چوتھا ڈاکٹر: جی ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔

اور پھر اسی اصول پر عمل ہونے لگا کہ ڈوز اور پوٹنسی بڑھائی جائے۔ پوٹنسی بڑھانے کے لیے الفاظ کا ذخیرہ بڑھانا پڑا اور بے شمار ضمیمے کئی شکل میں کئی کلو کاغذ پر مشتمل ہو گیا۔ فی الحال سائیکوتھراپی کے بارے میں کسی نے نہیں سوچا اور سوچتا بھی کیسے؛ نفسیاتی معالج خود نفسیاتی مریض تھے۔ بڑے بڑے دعوے کرتے تھے مگر سامنے رکھا ہوا آئینہ چیخنے لگتا تھا اور مرض اور مریض کے بجائے MAXIMUM سامنے آجاتا تھا۔ محنتانہ اور فیس جیسے فیشن ایبل الفاظ وسیع ہوتے چلے جاتے تھے اور اب تو ایڈوانس کا رواج تھا۔ مریض کے ملاقاتی حجرے یا کونے میں داخل ہونے سے پہلے MAXIMUM منہ پھاڑے کھڑا مریض کا راستہ مسدود کر دیتا تھا۔ سب خاموش تھے کیونکہ مرض چوکیدار سے شروع ہوتا تھا اور وائرس کی پرواز سب سے اونچے سنگھاسن تک جاتی تھی۔

"لیکن یہ بیماری کہاں سے آئی ؟" ایک بیمار نے تکیے سے سر اٹھا کر اپنے روم میٹ سے پوچھا۔

"ارے بھائی، یہ تو موروثی ہے۔ اس کے بہت سے نام ہیں۔ نذرانہ، ڈالی، بخشش، ھدیہ، محنتانہ، چلئے پانی، مٹھائی، پان پتہ، تحفہ، اور ایک اور نیا نام سننے میں آیا ہے۔۔۔۔"

اور وہ خاموش ہو گیا۔

"ہاں ہاں، بولو نا"

"کیا بولوں ؟"

"نیا نام"

"کان ادھر لاؤ، قائداعظم"

"لاحول ولاقوۃ، وہ کیسے ؟"

"بھائی نوٹوں پر قائداعظم کی شبیہ ہوتی ہے"

اس بار دوسرا سکتے کے عالم میں آگیا اور پہلے اباؤٹ ٹرن کیا پھر پینتالیس ڈگری گھوما پھر ساٹھ ڈگری جیسے اپنا قبلہ درست کر رہا ہو۔ پھر جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا۔ پھر بڑبڑانے لگا "سنو یہ ہے تمہارے احسانوں کا بدلہ۔ تمہاری تصویر سے گندی ہتھیلی گرم و نرم کی جاتی ہے"

دوسرا قہقہہ مار کر ہنسا۔ پھر بولا۔

"بھائی اتنے ملول نہ ہو۔ یہ تو چھوٹے لوگ کرتے ہیں جن کی پہنچ بینک اور خصوصاً سوئز بینک تک نہیں ہے"

"کیا تمہارا مطلب ہے کہ سوئز بینک میں نارکوٹک کا پیسہ ہوتا ہے"

"نارکوٹکز کا نہیں بھائی شوگر کوٹک کا"

"وہ کیا ہوتا ہے ؟"

"اس میں پیسہ نہیں چلتا، کاغذ اور کتاب اور کمپیوٹر چلتے ہیں اور بے دیکھے اور بولے اور سنے لوگوں کی تقدیر بدل جاتی ہے"

"اچھا چھوڑو سوئزر بینک کو۔ پستہ قد وائرس کی بات کرو"

"تو سنو" اور اس نے ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔

"اجی کام بہت ہے۔ وہ دیکھ رہے ہیں آپ رجسٹروں کے انبار"

"تو کب باری آئے گی؟"

"دیکھیے دس پندرہ دن"

"کچھ جلدی کام نہیں ہو سکتا؟"

"ویسے تو مشکل ہے۔ ہاں ایک ترکیب ہے"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ اوور ٹائم کروں صرف آپ کے لیے"

"آپ کو زحمت ہوگی"

"اجی ایسی ویسی۔ بھائی لنچ کا خرچ، آنے جانے کا کرایہ، نیند کے اوقات کا زیاں، بیوی کی قربت سے محرومیت....."

اور وہ جلدی جلدی کہنے لگا۔

"اچھا چھوڑیے بھی اتنی تکلیف ہے تو میں انتظار کر لیتا ہوں"

"انتظار سا جی زندگی بھر انتظار کرنا پڑے گا۔ کان ادھر لائیے...."

"یہ فائل کھو بھی سکتی ہے"

"ارے نہیں ایسا نہیں کیجیے گا۔ میں نے بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر یہ چھوٹا سا گھر خریدا ہے...."

"ٹھہریے۔ کتنے قائد اعظم ہیں آپ کے پاس۔ لال والے نہیں، ہرے بھی نہیں نیلے....."

"کیا مطلب آپ کا؟"

"لیجیے اب آپ اشاروں کی زبان بھی نہیں سمجھتے۔ ان سے بات کر لیجیے۔ مشتاق ادھر آنا۔ دیکھو ان صاحب کو اس کرسی پہ لے جاؤ اور چائے پلاؤ۔ میں ذرا دوسرے

کی فائل سے نمٹ لوں .....''

اس کے بعد ٹیپ ختم ہو گئی۔

دوسرے نے سوال کیا" پھر کیا ہوا ؟"

"کیا ہوتا ہے۔ دام آوے کام"

"لیکن فرض کی قیمت ؟"

"جی نہیں۔ اوور ٹائم کی"

"کیوں دفتر میں کام نہیں ہو سکتا تھا ؟"

"بہت بھولے ہیں آپ ! بھلا قائداعظم بیچ میں ہو اور کام نہ ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے"

"پھر تم قائداعظم کو بیچ میں لے آئے"

"بھائی یہ مجاز مرسل ہے (METONYM) اور پھر نقل کفر کفر نہ باشد۔ میں تو دوسروں کے دیے ہوئے نام دہرا رہا ہوں"

"تو کیا ہر جگہ لال اور ہرا اور نیلا ہی چلتا ہے"

"جی نہیں یہ تو چھوٹے لوگوں کی بات ہے۔ قائداعظم کو تو وہ یاد کرتے رہتے ہیں۔ بڑے آدمی تو رسمی طور پر خاص دنوں میں پھول چڑھاتے ہیں"

"تو کاغذ اور کتاب اور کمپیوٹر اور رجسٹر کس لئے ہوتے ہیں ؟"

"وہ قائداعظم کا بدل ہوتے ہیں۔ بس رات کو سوئے صبح کو کروڑپتی"

"اور جو پہلے سے کروڑپتی ہو"

"وہ ارب پتی۔ پیسے کو پیسہ کھینچتا ہے"

"اور وہ ڈراؤنے کاغذ اور سکشن نمبر اور رول اور شیڈول ؟"

"وہ تو یہ لوگ خود بناتے ہیں اور اس سے دوسروں کو ڈراتے ہیں"

"یہ خوب ہے۔ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی"

"اجی نہیں۔ خیر کس کو دکھائی دیتی ہے۔ پردا اور غلاف OPAQUE ہوتا ہے"

"مگر ؟"

"مگر تمہیں سننا چاہتے ہو"؟ اور اس نے دوسرا کیسٹ لگا دیا۔

"مگر یہ تو کتاب میں لکھا ہوا ہے!"

"تو کیا ہوا؟ بھائی کبھی کبھی تو لکھنے والا خود نہیں سمجھتا۔ پھر اسے ان لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جو خود نہیں سمجھتے، پھر وہ کتاب میں آتا ہے، پھر کمیٹی بنتی ہے، پھر رولز بنتے ہیں، پھر حکمنامے جاری ہوتے ہیں، اور اگر تمھاری سمجھ میں آجاتا تو وکیلوں کی کیا ضرورت تھی، اور میرا خرچ کیسے چلتا۔ پھر وہی بے روزگاری کے مسائل پیدا ہو جاتے تو بھائی ساری کائنات تفریق پر قائم ہے، خالص منفی عمل پر جو تمہیں مثبت دکھائی دیتا ہے۔ یہ معصوم شہری اور ستر فی صد الف بے پڑھے ہوئے دوست اور پانچ فی صد پڑھنے والے، یہ سب زندہ رہیں گے، اور ہمیں بھی زندہ رکھیں گے، اور دیکھئے نا، میں آپ کے دو ہزار بچاتا ہوں۔ ایک ہی ہزار تو مانگ رہا ہوں۔"

"مگر آپ تو سرکاری ملازم . . . . ."

"ہاہاہا۔ جی ہاں، سرکاری ملازم! آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہے؟"

اور ٹیپ ختم ہو گئی۔ اس نے ٹیپ الٹ کر لگا دی۔

"بھائی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم لوگ یہ لفظ بدل کیوں نہیں دیتے۔ یہ تو سب لفظوں کا کھیل ہے۔ اگر منافع، مضاربہ، مارک اپ، جیسے موٹے کپڑوں کے خلاف گناہ کو ثواب میں بدل سکتے ہیں تو گھوس کو ہدیہ اور نذرانہ اور محنتانہ وغیرہ کیوں نہیں کہہ سکتے!"

اور ٹیپ ختم ہو گئی۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر بند کر دیا۔

"خوب یاد آیا۔ میں تمہیں اسی بات پر ایک کہانی سناتا ہوں۔"

ایک ضرورت مند ایک دولت مند کے پاس قرض لینے کے لیے گیا۔ اس نے کاغذ اور قلم منگوایا اور بولا۔

"لکھو"

"میں کیوں لکھوں؟"

"کیوں تم قرضہ نہیں لوگے؟"

"جی ضرورت تو ہے۔"

تو لکھو جو میں کہتا ہوں۔

"آج تاریخ ..... میں سیٹھ ..... کو ایک ہزار کیلوگرام دال مونگ کی بوریاں پانچ ہزار روپے میں بیچ رہا ہوں .... اب دستخط کرو ...... یہ دوسرا کاغذ لو اور لکھو"

آج تاریخ ..... میں سیٹھ سے ایک ہزار کیلوگرام دال کی بوریاں دس ہزار روپے میں خرید رہا ہوں۔ قیمت دو دن بعد ادا کروں گا۔"

"دستخط کرو۔ یہ لو پانچ ہزار روپیہ ..... ایک سال بعد دس ہزار روپیہ واپس کرنا۔ تمہارا بھی کام چلے میرا بھی۔"

"مگر یا اخی اس کی کیا ضرورت تھی۔ آپ یہ نہ بھی لکھتے تو بھی میں آپ کو ایک سال بعد دوگنی رقم دے دیتا۔ آپ میرے وقت پر کام آئے ہیں۔"

"نہیں بھائی۔ اس طرح میں اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"

اور ٹیپ ختم ہو گئی۔

"یہ تو تم نے سود کی کہانی سنا دی۔"

"نہیں۔ میں نے سود کو ثواب اور قانون نا مناسب بنانے کی کہانی سنائی ہے۔"

"مگر بات تو میری فائل کی ہے۔ وہاں تو صرف سود خور جہنمی ہے۔ ضرورت مند مظلوم، مگر اس معاملے میں تو ضرورت مند بھی جہنمی ہے۔"

"بھائی وہاں بھی لفظوں کا کھیل کھیلا جا سکتا ہے۔ لو میں تمہیں ایک تجربہ سناتا ہوں۔"

"بہت متبرک ہستی کا مزار تھا جس پر عورتوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ باہر چوکیدار بیٹھا تھا۔ چوکیدار کیا تھا ایک عبادت گزار، متقی، تسبیح پھیر رہا تھا۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ مزار پر پہنچا۔ میری بیوی کی خواہش تھی کہ وہ مزار پر جا کر فاتحہ پڑھے۔ مگر متقی چوکیدار نے انھیں باہر روک لیا۔ میں فاتحہ پڑھ کر لوٹا تو اپنی پرانی رسم اور آباؤ اجداد کی منتقل شدہ عادت کے تحت کچھ رقم چوکیدار کو دی۔ جو اس نے فوراً قبول کر لی۔ میں جانے لگا تو اس نے کہا "ٹھہر جاؤ۔"

میں نے سمجھا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ وہیں رک گیا، اور پھر اس نے میری بیوی سے ڈرامائی انداز میں کہا۔" ادھر آؤ۔" میری بیوی قریب گئیں تو بولا" جوتا اتارو۔" اور انھوں نے جوتا اتار دیا۔ میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آرہا تھا کہ وہ چوکیدار کیا کہنا یا کرنا چاہتا ہے۔ پھر اس نے میری بیوی سے کہا۔" اندر جاؤ اور فاتحہ پڑھ کر فوراً آجاؤ۔"

میں ساتھ جانے لگا تو اس نے روک لیا۔

"تم نہیں۔ بس یہ جائیں گی۔"

میں اکیلا رہ گیا تو مجھ سے بولا۔

"تم نے مجھے" ہدیہ" دیا ہے، اب میرا بھی فرض ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ کروں۔"

تو بھائی اس کہانی سے سبق حاصل کرو اور ہدیہ دو۔ کام ہو ہی جائے گا۔ کیوں کر یہ تو اس کا بزنس ہے۔ وہ اپنا بزنس خراب تو نہیں کرے گا۔ ویسے اگر یہ تمہارا آخری کام نہیں ہے تو تم بھی اپنا بزنس خراب نہ کرو۔"

دوسری کانفرنس میں ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ تھا۔

"یہ وائرس بیکٹریا بن چکا ہے اور عالم گیر ہے صرف بیماری کی INTENSITY کا فرق ہے۔ انجکشن، ہائی پوٹنسی دوائیں اُلٹا اثر کرتی ہیں۔ یہ بیکٹریا کو اور زیادہ پوٹنٹ کر دیتی ہیں۔ ہمیں ان کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ہم اپنی شاہانہ، غلامانہ اور میاں اور اسامی والی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے دو قسم کی دواؤں سے کام لیں۔ بڑے آدمی کی بیماری کو ہم روایتی دوا، نذرانہ، ڈالی وغیرہ سے بہلانے کی کوشش کریں اور اوسط درجے کے لوگوں کے لیے ہدیہ، تحفے کا لیبل استعمال کریں۔

کسی نے چپکے سے کہا۔" اور وہ جو دینی کتابوں میں ہے ؟"

ایک ڈاکٹر جو متقی تھا بولا" انھیں متشابہات میں شمار کریں اس کے سمجھنے کی ذمے داری اللہ اور 'راسخون فی العلم' پر ڈال دیں۔"

اور جب یہ کہانی ایڈیٹر کے پاس پہنچی تو اس نے برہم ہو کر کہانی کار سے کہا۔

"یہ کہانی ہے یا وعظ"

"جی، میں نے تو وہ لکھا ہے جو ہے اور ہو سکتا ہے۔ میں نے کب کہا ہے کہ کیا ہونا چاہیے، اور یوں بھی سو لوکڑا پی میرے بس کی بات کہاں ہے؟"

○
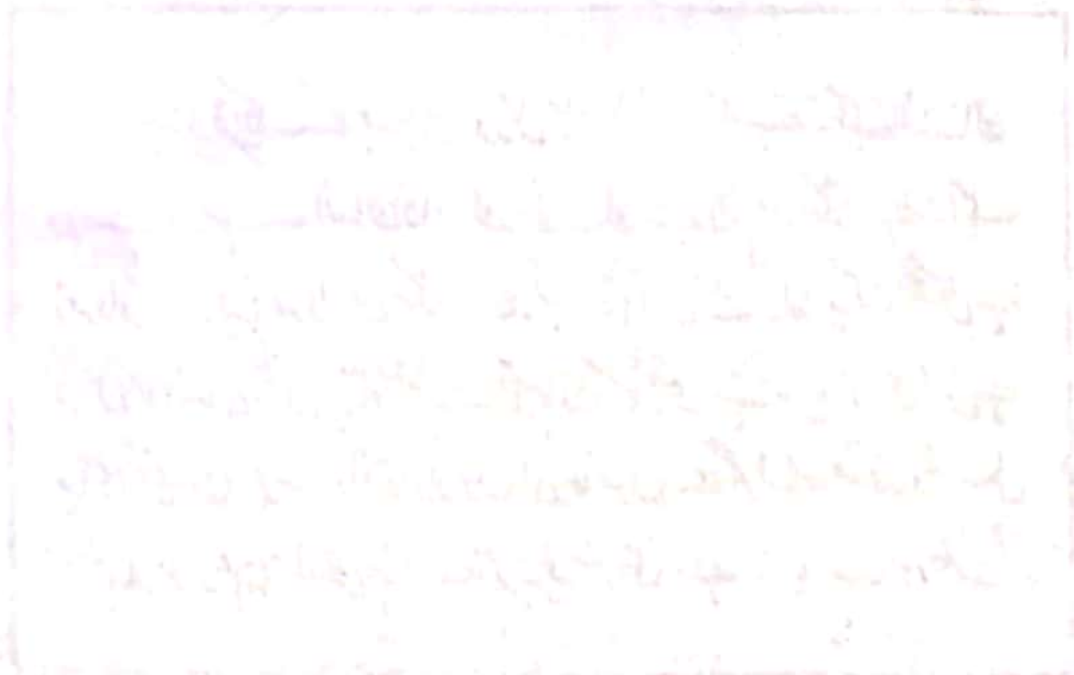
شیزوفرینک کے جذبات اور عمل میں فرق ہوتا ہے۔ ایک انسان
دوست اور مہذب انسان ظالم اور سفاک اور بے رحم بن سکتا ہے۔ ایک
ذمہ دار شخص غیر ذمہ دار بن سکتا ہے۔ لیکن عام آدمی کے لئے یہ کہنا مشکل ہے
کہ اس کا انسان دشمن برتاؤ نفسیاتی بیماری کا نتیجہ ہے یا ارادی فعل ہے
سیاسی شخصیتوں، برسرِ اقتدار لوگوں اور حاکموں سے اگر ایسے متضاد عمل
کا اظہار ہو تو کہنا مشکل ہوتا ہے کہ یہ غیر شعوری ہے یا سیاست اور حکمت عملی

# ضرب المثل

"لوگوں نے مجھے لکھنا کیوں سکھایا۔"

یہ حکمران بننے کے بعد اس کے پہلے الفاظ تھے جو اس نے مجرم کی موت کے پروانے پر مُہر ثبت کرتے وقت کہے۔ اس کی پہلی تقریر ایک خوش آئند مستقبل کی پیش گوئی سمجھی گئی۔"

"اچھا، تو وہ ضرب المثل؟"

"وہ بہت بعد کی بات ہے۔ اپنی ماں کو قتل کروانے کے بعد کی۔"

"کیا؟ اپنی ماں کو قتل کروا دیا"

"ہاں اقتدار سب کچھ کرواتا ہے"

"اقتدار یا ہوسِ اقتدار؟"

"اقتدار تو اس کے پاس تھا ہی"

"تو پھر شاید اقتدار چھن جانے کا خوف؟"

"شاید۔ لیکن اس کے کارنامے کے بارے میں تو سنو"

"شیزد"

"ہاں مگر قبل از وقت نتیجہ نکال رہے ہو۔ یہ تصویر دیکھ رہے ہو۔

کلوشیم کی تصویر جس میں دو پہلوان لڑ رہے ہیں۔ ہاتھوں کی لڑائی، پتھروں

کی لڑائی، تلواروں کی لڑائی۔ سارا جسم لہولہان۔ اس کا ایک کی ہار اور دوسرے کی جیت پر ختم ہونا ضروری ہے لیکن درحقیقت دونوں قتل ہوتے ہیں۔ ایک قتل کیا جاتا ہے اور دوسرا زخموں کی تاب نہ لاکر مر جاتا ہے۔ اور یہ دوسری تصویر دیکھو۔ یہ حکمران اور اس کے ٹولے کی عشرت گاہ ہے۔ یہاں سے خونی کھیل کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔"

"سیڈسٹ"

یہ تو بہت ہی ہلکا لفظ ہے اور سیڈسٹ کو اپنا زور آزمانے کے لئے میسوکیسٹ بھی تو مل جاتا ہے۔ مگر یہ موت کے کھیل کا شوق اور مُردوں کو دیکھ کر ہنسنا۔ یہ تو کاؤنٹ ڈسیڈ کے لئے بھی سانحہ ہوتا۔ وہ لاش کے ساتھ کیا کرسکتا تھا۔"

"مجھے رونا آرہا ہے"

"ہاں۔ اور شاید اُسے بھی اس کا احساس تھا۔ اس نے بند کروا دیا یہ کھیل"

"واہ۔ پھر وہ ضرب المثل؟"

"پھر وہی سوال۔ سنتے جاؤ ... اس نے اس کھیل کی جگہ دوسرے مقابلے شروع کئے۔ شاعری اور موسیقی کا مقابلہ۔ وہ ڈرامے اسٹیج کرواتا تھا۔ اس میں خود بھی ایک ایکٹر کی حیثیت سے حصّہ لیتا تھا اس نے چوتارا اور سارنگی بجانا سیکھا۔ اور آرٹ اور ادب کے مربّی کی حیثیت سے مشہور رہا۔"

"پھر تو وہ اچھا خاصا انسان دوست اور فن و فراست کا رسیا تھا"

تیسرا آدمی قہوہ خانے میں ابھی ابھی داخل ہوا۔ اس نے دور کرسی پر ان دونوں کو براجمان پایا۔ ایک خالی کرسی قریب کرکے ان کے پاس بیٹھ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان دونوں کو جانتا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ ان کی باتیں سنتا رہا مگر بحث میں حصّہ نہیں لیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی اور خیال میں گم ہے۔ پہلا شخص دوسرے شخص کا جواب دینے کے بجائے تیسرے شخص کی جانب مخاطب ہوا۔

"کیا بات ہے، کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو"

"پریشان ہونے کی تو بات ہے۔ اب لوگ موت کی سزا دینے کو اخلاقی جرم سمجھنے لگے وہ کہتے ہیں کہ ایک تو مقتول کے مرنے سے معاشرے کا خسارہ ہوا ایک اور انسان کو

پھانسی دیکر معاشرے کو نقصان کیوں پہنچایا جائے؟"

پہلا شخص دوسرے شخص کی جانب مخاطب ہوا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ سیاست میں بھی بہت آزاد خیال اور رحمدل تھا۔ موت کی سزا اس نے بھی ختم کردی تھی۔"

"بڑا انقلابی قدم تھا"

تیسرا شخص بولا "آپ موت کی سزا کو ختم کرنے کو انقلابی قدم سمجھتے ہیں۔ کیا اس سے قتل کے جرم میں اضافہ نہ ہوگا۔"

"معلوم نہیں۔ کیا واقعی جرم سزا کے ڈر سے نہیں کیا جاتا؟"

"اور کیا۔ اور یہ ڈر نہ ہو تو کون اپنے مفاد کے لئے چوری ڈاکہ اور قتل سے باز رہے؟"

دوسرے نے کہا "میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔ جرم کرنے میں صرف سرکار کی جانب سے مقرر کی ہوئی سزا مانع نہیں ہوتی بلکہ ضمیر، تہذیب، مذہب سب مانع ہوتے ہیں۔"

پہلے نے کہا "بہر حال، لوگوں نے اس بات کو سراہا اور خوش آئند کہا۔"

"مگر وہ ضرب المثل؟"

بھائی ذرا صبر کرو۔ ابھی ابھی تم نے تہذیب اور مذہب اور ضمیر کی بات کی تھی۔ میں اس میں وراثت کا اضافہ کرتا ہوں۔"

تیسرے نے دخل دیا "غلط۔ وراثت کیا ہوتی ہے۔ اصل عنصر تو ماحول ہوتا ہے۔ اچھا ماحول ہو تو پیداوار اچھی ہوتی ہے۔"

دوسرے نے جلدی جلدی ایک کتاب کے ورق اُلٹے۔ اس میں ایک تصویر تھی جس میں ایک کسان کھیت میں بیج ڈال رہا تھا اور گاتا جاتا تھا۔ اس نے کتاب تیسرے کے سامنے رکھی۔

"یہ دیکھو، موسم اچھا ہے، آسمان پر بادل ہیں ، نہری زمین ہے، کھاد مناسب ہے مگر بیج صحیح نہیں تو پیداوار اتنی اچھی نہیں ہوگی۔"

"یہ تو بڑی عام سی بات ہے۔ انسانی بیج سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟ تیسرے نے دوسرے کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

دوسرے نے کہا " یہ تو جینیٹکس کا معاملہ ہے۔ اور میں اس کے متعلق زیادہ نہیں جانتا لیکن یہ جانتا ہوں کہ بیج کی اہمیت ہمیشہ رہی ہے۔ ڈاروِن کے تطوری منازل سے لیکر افلاطون کے یوٹوپیا تک۔ لیکن بھائی یہ ہم کدھر بہک گئے۔ میں تو ضرب المثل کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

پہلے نے کہا "ہم بہکے نہیں۔ وراثت اور ماحول کی بات ہمیں ضرب المثل تک لے جاتی ہے۔ اس کی ماں نے اپنے دوسرے شوہر کو قتل کر کے اپنے چچا سے شادی کی۔ پھر اپنے چچا کے بیٹے کو جو تخت کا جائز وارث تھا قتل کر کے اپنے بیٹے کو بادشاہ بنایا اور اس بیٹے نے اپنی ماں کو قتل کروا دیا۔ اس طرح اس کی شخصیت دو حصوں میں بٹ گئی۔

" وہی شیزو فرینیا والی بات "

"ہاں - وہی بات۔ اور پھر وہ شہر سے باہر تھا۔ شہر جل رہا تھا۔ وہ اپنی موسیقی میں مست تھا۔"

"مگر شہر میں آگ تو اس کی غیر حاضری میں لگی "

" تو میں کب کہتا ہوں کہ وہ آگ کا ذمہ دار ہے۔ مگر جب اسے آگ لگنے کی خبر ہوئی تو وہ سارنگی بجاتا رہا۔ جیسے سب خیریت ہو۔"

" مگر کیا وہ شہر میں نہیں آیا "

" آیا۔ شہر کے لئے بیشمار دولت اور تعمیر نو کا تحفہ لیکر۔ اور اس نے شہر کو ایتھنس کے ماڈل پر پھر سے تعمیر کیا۔ اسے پہلے سے زیادہ خوبصورت بنایا۔

مگر ضرب المثل تو یہی ہے کہ شہر جلتا رہا اور وہ سارنگی بجاتا رہا۔

ہاں - اس لئے کہ جلتی ہوئی آگ پر جلدی سے پانی ڈالنا زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ جلنے کے بعد نئی تعمیر ضرب المثل کا موضوع نہیں بنتی۔

تیسرا کھڑا ہو گیا اور قدرے غصہ میں بولا " لوگ کتنے احسان فراموش ہوتے ہیں تھوڑی سی تکلیف ہو تو تمام احسانات بھول جاتے ہیں۔

پہلے نے ہنس کر کہا " میں نے یہ تو نہیں کہا کہ ضرب المثل صحیح ہے یا غلط۔ میں تو بتا رہا تھا کہ ضرب المثل کیوں بنی اور اسے جامعیت کیوں حاصل ہوئی۔"